جلد (۱) ستمبر ۱۹۰۱ء نمبر (۶)

ایڈیٹر

شیخ عبد القادر بی - اے

مخزن

اردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامینِ نثر

فنِ تنقید - ایڈیٹر ... ۱

قرونِ وسطیٰ - شیخ غلام نقشبند صاحب - ۷

دلوں کے کھوٹ - مولوی عبد العزیز ایم - اے - ۱۷

علامہ جامی - آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب ... ۲۰

مطالعۂ الفاظ - مولوی احمد دین صاحب بی - اے وکیل ۲۱

عمر خیام - محمد صادق علی خاں از کشمیر ۲۵

مضمون نویسی - شیخ ضیاء الحق صاحب از ہاپوڑ ضلع میرٹھ ... ۳۱

حقوقِ رعایا - مولوی عبد الرشید چشتی بی - اے - ۳۵

مضامینِ نظم

مرزا غالب - شیخ محمد اقبال - ایم - اے - ۳۹

کوئی نہیں - منشی نادر علی صاحب نادر کاکوروی - ۴۰

دماغ - خاکسار فضل حق آزاد عظیم آبادی ۴۱

الفتِ مادری - محی الدین صاحب صدیقی نجیب آبادی از لکھنو - ۴۲

برسات - میر نذیر حسین احمد بی - اے - ۴۳

دارِ فنا - سید فرزند علی شاہ صاحب شریف ۴۴

کچکول ۴۶

...کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ☐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبد العزیز کے اہتمام سے چھپا

اور شیخ عبد القادر بی - اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

ہمارے قلمی معاونین

۱- مخزن کے قلمی معاونین سے درخواست ہے۔ کہ وہ مضامین صاف اور خوشخط لکھ کر یا لکھوا کر عنا
فرمایا کریں۔ اور ہمیشہ کاغذ کی ایک طرف پر لکھیں۔ اور دوسری طرف خالی چھوڑ دیں۔ اگر کوئی صاحب
مسودہ صاف نہ بھیجینگے۔ تو اول تو ممکن ہے کہ وہ مسودہ شائع نہ کیا جائے۔ اور جو کسی خاص
عجلت کے باعث شائع کیا بھی جائے تو اس میں غلطیاں رہجانیکا احتمال ہے۔ کاغذ کے دونو طرف
لکھے ہوئے مسودوں میں ترمیم کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ اور ترمیم کیجاتی ہے تو سارا مسودہ مسخ
ہوجاتا ہے اسلئے امید کیجاتی ہے کہ ہمارے عنایت فرمان دونو احتیاطوں کی کوشش سے پابندی کرینگے۔

۲- مضمون لکھنے میں اختصار کو مدنظر رکھنا باعث مشکوری ایڈیٹر ہوگا۔ کیونکہ اس رسالہ کا منشا
یہ ہے کہ ملک میں جتنے ہونہار مضمون نگار نئی پودیں مل سکیں۔ اُن سب کو رفتہ رفتہ اہل ملک سے خطاب کرنے
موقعہ دیا جائے۔ اور انکو اُبھارا جائے۔ اور اگر ایک ایک مضمون بہت زیادہ طول کھینچے تو مطلب فوت ہوجاتا

۳- جو حضرات انگریزی علم ادب کے مطالعہ میں زیادہ مصروف رہتے ہیں یا جنکو انگریزی علم ادب کا زیا
شوق ہو اُن سے التماس ہے کہ وہ اگر چیدہ چیدہ مقامات کا بامحاورہ ترجمہ مخزن کے لئے ارسال کرینگے تو
انکی یہ قلمی اعانت شکریہ کے ساتھ قبول کیجائیگی۔ خواہ چند فقروں کا ہی ترجمہ کیوں نہ ہو جو صاحب خود
ترجمہ کرنیکی زحمت نہ رکھتے ہوں۔ یا اُسکی ذمہ واری سے گریز کرتے ہوں۔ وہ ایڈیٹر کو مشہور کتب انگریزی
کے ایسے مقامات کا پتہ دیتے رہیں۔ جنہیں وہ خصوصیت سے پسند کرتے یا ترجمہ کے قابل سمجھتے ہوں

۴- جو باذاق صاحبان نظم کے حصے کے لئے انتخابی اشعار اساتذہ کے کلام میں سے چھانٹ کر
بھیجینگے۔ اُنکے انتخاب سے مخزن کے حصہ انتخاب میں استفادہ کیا جائیگا اور جہاں کہیں اُن کی چنے
ہوئے شعر درج ہونگے وہیں اُنکا نام بھی درج ہوگا۔ ہاں اگر وہ خصوصیت سے ہدایت کریں
کہ اُنکا نام درج نہ ہونا چاہیے۔ تو اُنکی خواہش کے مطابق عمل کیا جائیگا۔

مخزن

فنِ تنقید

ہندوستان میں علوم و فنون کی ترقی کی راہ میں ایک روک یہ رہی ہے کہ یہاں فنِ تنقید کا رواج نہیں تھا۔ اور باوجود ترقی کے مختلف خیالات پیدا ہو جانے کے آج تک یہ فن اس ملک میں رائج نہیں ہے۔ آج کل بعض تحریرات میں کہیں کہیں ناقدانہ جھلک نظر آتی ہے مگر ایسی تحریریں ابھی تعداد میں اسقدر کم اور وہ جھلک ابھی ایسی خفیف ہے۔ کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس فن کا رواج ہندوستان میں ہو گیا۔ مغربی دُنیا کے باشندوں میں جہاں آج کل اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ لوگ ہنروروں کے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں۔ نظم و نثر کی تصنیفات قبولِ عام کا خلعت پہننے سے پیشتر جوہریانِ سخن کی نقاد نظروں کے کامل العیار ترازو میں جانچی اور تولی جاتی ہیں۔ اور اُن سے سندِ درستی حاصل کرنے کے بعد سخن فہم قدردانوں کی نظروں میں سماتی ہیں۔ انگریزی میں ایک لفظ ہے "کرِٹک" جس سے مُراد ہے وہ شخص جو کسی فن کی نسبت رائے لگائے اور کھوٹا کھرا انصاف سے پرکھ دے۔ اِس لفظ سے مشتق ہے ایک لفظ کرِٹسزم جسکے معنے ہیں جانچنا۔ پرکھنا۔ تعجب ہے کہ اِس فن کا وجود تو ایک طرف ہمارے ہاں ابھی اِن دونو لفظوں کے صحیح ترجمہ کا فیصلہ نہیں ہوا۔ اِن الفاظ کے ترجمے عموماً غلط کیے جاتے ہیں۔ جو اِن کے اصل مفہوم سے بہت دُور ہیں۔ مدرسوں میں تو بعض نیم مُلّا

"کرٹسزم" کے معنے "نکتہ چینی" پڑھاتے ہیں یا بہت بڑھے تو "رائے زنی" کہدیا۔ اسمیں شک نہیں کہ کرٹسزم میں بعض اوقات نکتہ چینی ہوتی ہے۔ مگر بعض اوقات تعریف بھی ہوتی ہے اس لئے نکتہ چینی کچھ ٹھیک ترجمہ نہیں۔ ابتدائی تعلیم میں غلط معنے ذہن نشین ہو جانیکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض اچھے خاصے انگریزی خواں تحصیل سے فارغ ہونے پر بھی اس غلطی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور "کرٹک" کو محض نکتہ چین اور اسکے فن کو فقط نکتہ چینی جانتے ہیں۔ رائے زنی والا گروہ بمقابلہ ان کے راستی پر ہے۔ مگر اوّل تو یہ لفظ پورا مفہوم ظاہر کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرا کچھ کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ اپنے زمانے میں انگلستان کے نامور رائے زنوں میں گذرا ہے۔ خواہ مخواہ مذاق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ اور جو لوگ بالکل اصلی انگریزی لفظ سے ناآشنا ہیں۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ حضرتِ موصوف کس معاملہ پر رائے زنی کیا کرتے تھے۔ معاملاتِ ملکی سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ یا تمدنی امور میں زیادہ دخیل تھے۔ علوم کی طرف رجوع تھا یا فنون کی طرف۔ حالانکہ انگریزی لفظ کے معنے زیادہ تر علم اور فن کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کرٹک یا تو علمِ ادب کی تصانیف کے لئے ہوتے ہیں۔ یا فنِ نقاشی اور مصوری و معماری وغیرہ کے لئے۔ اگر اور کسی چیز کی نسبت رائے دینے والے لوگوں کا ذکر کرنا ہو تو اسکا نام لینا پڑتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ فلاں چیز کے "کرٹک"۔ ان دو ترجموں کے علاوہ حال میں کہیں کہیں لفظِ "نقید" اس معنے میں استعمال ہوتا نظر آیا ہے۔ مگر اہلِ زبان کی غفلت اور سہل انگاری سے رواج نہیں پا سکا۔ کیونکہ بعض ایسے لکھنے والوں نے جو اُستادوں میں گنے جاتے ہیں۔ اس کوشش سے کہ اپنی زبان کے کسی لفظ کو ان معنوں میں رواج دیں۔ اجتناب کیا اور عافیت اس میں سمجھی کہ اصل انگریزی اصطلاح اُردو کتابوں میں لکھدیں۔ گر بدقسمتی سے وہ واحد اصطلاح ایسی ہے کہ اُس کا تلفظ آسان نہیں۔ کبھی فارسی خوان اصحاب کی زبان سے جو اس اصطلاح کو سُنا ہے تو سخت ہنسی آئی ہے۔ فرمانے لگے "ہمارے ملک میں ابھی کرٹک نہیں نکلتے"۔ جو پوچھا "صاحب وہ کیا"۔ تو بولے "یہی جو کتابوں

پر "کِری ٹی سزم" لکھتے ہیں۔ ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اصطلاح اُن انگریزی الفاظ میں سے نہیں ہے جو اُردو میں عام طور پر مقبول ہو سکتے اور جُزوِ زبان بن سکتے ہیں۔ یہ ایسی اصطلاح ہے کہ اسکا تلفظ اگر انگریزی خوانوں کی زبان سے صحیح طور پر بھی ادا ہوگا تو بھی اُردو آشنا کانوں کو کھٹکیگا۔ اِس لئے ضروری ہوا کہ اُسکے لئے ایک لفظ ایسا تلاش کیا جائے جو زبانِ اُردو میں پہلے سے مروّج ہو۔ اور جو اِس اصطلاح کے مفہوم کو ادا کر سکے ہماری نظر میں اِس مطلب کے لئے "تنقید" سے بہتر کوئی لفظ نہیں۔ اور ہم تو آج سے ہی "کِری ٹی سزم" کو سلام کہتے ہیں۔ اور تنقید سے کام لینگے۔ کرٹک کو ہم نقاد یا ناقدِ سخن کہینگے۔ کیونکہ ہمیں ابھی علم ادب ہی کے نقادوں سے کام ہے۔ اور اِن دو لفظوں کے رواج کو فنِ تنقید کی ترقی کا پہلا زینہ سمجھینگے۔ اور فنِ تنقید کی ترقی۔ اگر یہ فن ایماندار اور انصاف پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ ہمارے علم ادب کو اُس معراجِ ترقی پر پہنچاویگی۔ جسکے اکثر ہواخواہانِ مُلک دل سے آرزومند ہیں۔ اِس وقت مصر میں عربی زبان کا علمِ ادب غیر معمولی ترقی کر رہا ہے۔ یورپ کے علمی اور ادبی خزانے مالِ غنیمت کی طرح ملک کے ذخیروں کو مالامال کرنے کے لئے لوٹے جا رہے ہیں۔ جو کام پہلے سلطنتیں کرتی تھیں وُہ عوام کر رہے ہیں اور ہر قسم کی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں۔ وہاں ضرورت نے بہت سے غیر زبانوں کے لفظوں کو اختیار کرنے اور بعض کے لئے اپنی زبان کی اصطلاحیں ڈھونڈھ نکالنے پر مجبور کیا ہے۔ مگر اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ جن لفظوں کو اختیار کیا ہے۔ انکو بالعموم خوبصورتی سے اپنا بنا لیا ہے اور جن کے ترجمے ڈھونڈھے ہیں۔ ایسے موزون کہ لفظی رعایت بھی ملحوظ ہے اور مطلب بھی ادا ہو گیا ہے۔ انھی ترجموں میں یہ لفظ "تنقید" ہے۔ وہاں اکثر اخبارات یا رسالوں میں جہاں تازہ تصانیف کی پرکھ ہوتی ہے۔ وہاں صفحہ یا کالم کے اُوپر "باب التنقید" لکھا ہوتا ہے۔ خود کالم کے لفظ کی بجائے "عمود" لکھتے ہیں۔ جو انگریزی لفظ کا صحیح ترجمہ ہے۔ اور اگر ہمارے

اخبارات میں کالم کا لفظ حد سے زیادہ مروّج نہ ہو چکا ہوتا اور یوں بھی ایک سادہ اور سہل لفظ نہ ہوتا۔ تو ہم زور سے رائے دیتے کہ "عماد" کو یہ نئے معنے عطا کئے جائیں۔

فنِ تنقید کے رواج کے لئے دو تدبیریں ہمارے ذہن میں ہیں۔ ایک تو یورپ کی بعض مشہور تصانیف میں سے وقتاً فوقتاً اِس فن کی نسبت اقتباسات درج کرنا۔ دوسرے اصولِ فن کے موافق اِس رسالہ میں آج کل کی بعض مشہور تصنیفات کو تنقید کے ترازو میں تولنا اور نتیجہ بلا کم و کاست ظاہر کرنا۔ یہ دونو کام بجائے خود مشکل کام ہیں۔ پہلی تدبیر میں تو ترجمہ کا کام نہایت دشوار ہے۔ اس فن کی مختلف اِصطلاحیں تعداد میں اِس قدر ترقی کر گئی ہیں اور مدح و ذم کے لیسے ایسے باریک پہلو نکالے گئے ہیں۔ کہ اُن عبارات کو جو وہاں صدیوں میں سمجھی ہیں۔ اُردو میں ادا کرنا کارے دارد۔ دوسری تدبیر میں علاوہ اسکے کہ صحیح تنقید کوئی آسان بات نہیں۔ وقت یہ ہے کہ مصنفین اور مطابع ابھی سچی تعریف اور سچی مذمت سُننے کے عادی نہیں۔ یہاں مدت سے تقریظوں کا رواج رہا ہے۔ کوئی پرانا دیوان یا کتاب اُٹھا کر دیکھئے۔ قلمی نسخہ ہو یا چھپا ہوا۔ آخر میں صفحوں کے صفحے تقریظوں سے پُر ہیں۔ ہمیں یاد نہیں کہ آج تک کوئی ایسی تقریظ کسی کتاب کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ جس میں جہاں دس خوبیاں جتائی ہیں۔ ایک آدھ نقص بھی جتا دیا گیا ہو۔ مصنف کو دیکھئے تو ہر تقریظ لکھنے والے کے قلمِ جواہر رقم طبعِ رسا اور کلکِ گہر سلک کے گیت گا رہے ہیں۔ اور تقریظوں کو دیکھئے تو سب کی سب کتاب کو لاجواب۔ رشکِ آفتاب و مہتاب۔ ہزاروں میں اِنتخاب بتا رہی ہیں۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کتاب کتنے تعریفی الفاظ کی مستحق ہے اور ہر شخص یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی تقریظ دوسرے سے زور والی ہو۔ تقریظ لکھنا ہر شخص کے لئے اپنی طبع آزمائی کا موقعہ ہوتا تھا۔ نہ کہ مصنف کو ایسی داد دینے کا جسکا وہ مستحق ہو۔ بعض ایسی مثالیں بھی دیکھنے اور سُننے میں آئی ہیں کہ تقریظ میں تو تعریف کے پُل باندھ دیئے اور ویسے اگر کسی نے پوچھا کہ کتاب کیسی لکھی گئی ہے تو

کہہ دیا۔ کہ کتاب تو مبتدیانہ مشق ہے۔ ہم نے تو ایک دوست کی خاطر سے تقریظ لکھ دی ہے۔ تقریظوں کے علاوہ بعض پرانی کتابوں پر نکتہ چینی بھی کیگئی ہے۔ مگر اُس کا مذاق یہ نہیں۔ کہ ع عیب ہے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ بلکہ یہ کہ اُسکو سراپا عیب اور ہمہ تن نقص قرار دیتے تھے۔ ایک ایک لفظ پر اعتراض۔ حرکات۔ سکنات پر گرفت۔ بندش پر نکتہ چینی۔ مضمون پر حرفگیری۔ ایسے ہی لوگوں کی شان میں میر انیس مرحوم لکھ گئے ہیں۔

مزا یہ طرفہ ہے۔ مضمون تو دستیاب نہیں — مقابلہ پہ چڑھائے ہیں آستینوں کو
یہ لفظ غلط وہ بندش بری یہ مضمون سست — ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

غرض افراط تفریط کی عملداری رہی ہے۔ اور مذاق میانہ روی سے آشنا ہی نہیں نتیجہ یہ ہے کہ کتاب کی تعریف کر دینا نشانِ دوستی سمجھا جاتا ہے اور نہ کرنا یا کوئی اعتراض کرنا علامتِ دشمنی ہے۔ آپ ذرا کسی کی کتاب میں کوئی نقص بیان کیجئے مصنف کے بیسیوں طرفدار آپ کی پگڑی اتارنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آپ میں کتاب کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ اس حالت میں آزادی سے تصانیف پر رائے دینے کا بیڑا اٹھانا ایک جہان سے دشمنی پیدا کرنا ہے۔ اور دشمنی بھی وہ جسے خدا واسطے کی دشمنی کہتے ہیں۔ یعنے نہ کوئی ذاتی غرض نہ عناد۔ صرف ملک کے علم ادب اور مذاق کی اصلاح اور منفعت عام کی غرض سے تو تنقید لکھی جائے اور جنکے کلام پر تنقید ہو وہ ایسے بگڑیں کہ دل میں غصہ بھر لیں۔ اور بدلا لینے کی فکر میں رہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ تنقید کی برداشت لوگوں میں پیدا ہوتی جائیگی۔ مگر ابتدا میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہے۔ ہم سردست یہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کتابیں **ریویو** کے واسطے بھیجی جائینگی ان کو دو قسم میں تقسیم کرینگے۔ ایک وہ جن پر ہم ناقدانہ نگاہ ڈالینگے۔ اور انجمن کی نئی برقی شعاعوں کی طرح ناظرین کو اُس کے حُسن و قبح صاف دکھا دینگے۔ اس صیغہ میں ممکن ہے کہ ہماری سخن فہمی غلطی کرے۔ مگر نیت کبھی غلطی نہ کریگی۔ نہ کسی کا لحاظ تعریف کیطرف

راغب کریگا۔ نہ کسی کا عناد مذمت کیطرف۔ مال کو کسوٹی پر کس کے رکھدینگے۔ گاہک کا جی چاہے اُٹھائے۔ جی چاہے نہ اُٹھائے۔ جو صاحبانِ تصانیف یا صاحبانِ مطابع اِس معیار کو منظور فرمائیں تنقید کی فرمائش کریں۔ ورنہ لکھدیں کہ وُہ صرف تقریظ چاہتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی تقریظ "رشحۂ قلم جواہر رقم" تو نہ ہوگی۔ اُس پُرانے رنگ میں کسی قدر ترمیم کیجائیگی۔ اِس تقریظ کی تعریف یہ ہوگی۔

چشمانِ تو زیرِ ابروانند　　　دندانِ تو جملہ در دہانند

یہ بتا دیا جائیگا کہ کس مضمون کی کتاب ہے۔ کون صاحب مصنف ہیں۔ کیسی چھپی ہے۔ کیا قیمت ہے۔ شائد تقریظ کا یہ بہت درست مفہوم نہیں۔ مگر چونکہ تقریظ اپنے آپ کو اس درجہ سے بھی گرا چکی ہے۔ اِس لئے ہم اس سے یہ اصطلاحی مطلب لیتے ہیں۔

اگر کوئی صاحب یہ تحریر نہ فرمائینگے کہ وُہ تقریظ چاہتے ہیں یا تنقید تو ہمیں اختیار ہوگا کہ دونوں میں سے کوئی پسند کرلیں *

لارڈ بیکن کے لطیفے:-

— ایک مُصوّر مصوری چھوڑ کر حکیم بن بیٹھا۔ ایک ظریف نے اُس سے کہا آپ نے خوب کیا۔ آگے تو ہر شخص آپکے فن کے عیب دیکھ سکتا تھا۔ اب کوئی نہیں دیکھ سکتا *

— سکندرِ اعظم نے اپنے زمانے کے ایک فلسفی کو بہت سا روپیہ بطور نذر کے بھیجا۔ فلسفی نے لانے والے سے پوچھا "بادشاہ سلامت نے مجھے روپیہ کیوں بھیجا اور شہر بھر میں کسی اور کو کیوں نہیں بھیجا"؟ وُہ بولا "کہ سرکار وُہ آپ کو ایتھنز میں سب سے نیک آدمی سمجھتے ہیں"۔ فلسفی نے جواب دیا "اگر فی الواقع یہ بات ہے تو میری طرف سے اُنکی خدمت میں عرض کردو کہ وُہ مجھے نیک ہی رہنے دیں" *

قرونِ وسطیٰ

(۱)

ہمارے کرمفرما شیخ غلام نقشبند صاحب جو اکثر اُردو اخبارات میں مضمون لکھتے رہتے ہیں اور خصوصاً اخبار وکیل کے اوراق میں بہت سے مفید مطالب پر بحث کر چکے ہیں۔ مخزن کے واسطے یہ تاریخی مضمون بھیجتے ہیں:۔

جن لوگوں نے براعظم یورپ کی تاریخ شروع سے لیکر آج تک دیکھی ہے اور اُس کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے آغاز کے وقت یورپ کی تاریخ میں جس قدر پیچیدگیاں ہیں۔ وہ بعد کے کسی حصہ میں نہیں ہیں۔ اور اگر اُس وقت ی تاریخ بخوبی سمجھ میں نہ آئے تو پھر بعد کی تاریخ کا نہ تو کچھ پتا چلتا ہے اور نہ وہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ تاریخ کے اِس حصہ کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس وقت ی مختلف قوموں کی جائے سکونت اور طرزِ معاشرت کو ذرا پیشِ نظر رکھ لیا جائے۔

یورپ میں سب سے پہلے باقاعدہ سلطنت کا پتہ اہلِ کنعان کی بستیوں میں ملتا ہے۔ ان لوگوں نے یونان اٹلی ہسپانیہ اور شمالی افریقہ میں جا بجا اپنی آبادیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ہاں ان لوگوں نے مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اور اُن کے جہاز مالِ تجارت سے ے ہوئے ہمیشہ ان بستیوں کو آتے جاتے رہتے تھے۔

اہلِ کنعان کے بعد اہلِ یونان کا دور آتا ہے۔ اہلِ یونان نے بھی اپنے مُلک کے ر ایشیا جنوبی یورپ اور افریقہ میں جا بجا بستیاں قائم کیں۔ اِن نو آبادیوں میں یونان ی طرز پر حکومت و قانون ہوتا تھا۔

ان دونوں قوموں کی بستیوں کے علاوہ معلوم نہیں کہ باقی یورپ کی اس وقت یا حالت تھی۔ آیا وہاں باضابطہ سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ شہر آباد ہو گئے تھے۔ یا نا حال

خانہ بدوش قومیں ہی خُدا کی زمین پر گشت کیا کرتی تھیں - یہ تو یقینی امر ہے کہ یُورپ کے شمالی حصص بالکل غیر آباد تھے - وہاں تا حال کسی شہر یا قریہ کی بُنیاد نہ پڑی تھی اور قیاس یہ چاہتا ہے کہ جنوبی یُورپ کی حالت بھی اس سے کچھ بہتر نہ تھی -

حضرت عیسیٰ سے ۷۵۳ سال پہلے دو بھائیوں نے اُس مُلک میں جسے اب اٹلی کہتے ہیں - ایک شہر کی بُنیاد رکھی - اِس شہر کا نام اپنے بانی کے نام پر رومہ ہُوا - یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جس نے بعد میں کل جنوبی یُورپ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ پر سلطنت کی - یہ سلطنت اپنے قوانین اور آئین سلطنت کے لئے کل یُوروپ کی اُستاد مانی گئی ہے - اور اُس زمانہ میں جب دُنیا کا اکثر حصّہ خانہ بدوش قوموں کی جاگیر میں تھا ایسی منتظم اور آئینی سلطنت کا دُنیا کے طبقہ پر قائم ہونا فی الواقع نہایت ہی حیرت انگیز ہے - یہ سلطنت خاص رومہ میں تو ۴۷۶ء تک یعنے (۱۲۲۹) سال قائم رہی - مگر اسکا مشرقی حصّہ جسے مشرقی یا یُونانی سلطنت کہا کرتے تھے ۱۴۵۳ء تک یعنے (۲۲۰۲۶) سال تک قائم رہا ہے - اِس سلطنت کی آئین ہی حیرت انگیز نہیں ہے - بلکہ ایسی وسیع سلطنت کا اِتنی لمبی عُمر پانا عجائبات میں سے ہے -

یُوروپ کے مؤرخین نے خاص رومہ کی سلطنت کے تباہ ہونے تک کے زمانہ کو زمانۂ سلف لکھا ہے - اور اسکے بعد کے زمانہ کو زمانۂ وسطی کہتے ہیں - اسوقت صرف یہی مقصود ہے کہ زمانۂ وسطی کے آغاز میں یُوروپ میں جو تغیرات ہُوئے انہیں مختصراً بیان کر دیا جائے

شہر رومہ کی چار دیواری تو دونو بھائیوں نے مل کر تیار کر لی - مگر یہ ظاہر ہے کہ دو شخصوں سے کہیں شہر بسا ہے - اِس لئے اُنہوں نے گردنواح کے آوارہ مزاجوں کو وہاں آباد ہونے کی دعوت دی - لوگ آنے لگے - شہر کی آبادی بڑھنے لگی - اور اِرد گرد کی قوموں سے بھی تعلقات پیدا ہونے لگے - تعلق ہی لگاؤ کی جڑ ہُوا کرتا ہے - کہیں کہیں رشتے بھی پیدا ہوئیں - اور باہم جنگ ہونے لگے - مگر اہل رومہ کا ستارہ اوج پر تھا - یہ لوگ فتح نصیب تھے

نصرت ہاتھ باندھے اُس کے ہمراہ رکاب رہا کرتی۔ جہاں جنگ ہوتی۔ فتح کا سہرا اہل روما کے سر بندھتا۔ اِس طرح بتدریج کل ملک اٹلی اہل روما کے زیرِ نگین ہوگیا۔ اِس کے بعد سسلی کی نوبت آئی۔ جزیرہ سسلی میں ایک بستی اہلِ یونان کی تھی۔ افریقہ شمالی میں جہاں اب شہر ٹیونس آباد ہے وہاں اہل کنعان کی ایک بستی کارتھیج نام بھی تھی۔ اہلِ کارتھیج نے بھی سسلی میں ایک بستی قائم کر رکھی تھی اور ملک ہسپانیہ اور شمالی افریقہ میں بھی اُن کی بستیاں تھیں۔ جب اہلِ روما سسلی کی طرف متوجہ ہوئے تو اہل کارتھیج مزاحم ہوئے۔ اِس لیے اُن سے جنگ چھڑ گئی۔ مدتوں جنگ ہوتی رہی۔ اہل کارتھیج نے بڑے معرکے کے رن مارے۔ یہانتک کہ خود رومۃ الکبریٰ کو فتح کرنے کی ٹھان لی۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہو ولے اے میرؔ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مگر قسمت کا لکھا یوں ہی تھا کہ اہل روما کا بول بالا رہا۔ آخر اہل کارتھیج کو نیچا دیکھنا پڑا۔ شہر کارتھیج پر گدھوں کے ہل چل گئے۔ ہسپانیہ اور شمالی افریقہ اہل روما کے قبضہ میں آگیا۔ اِس کے بعد پھر سسلی بنائے تنازعہ ہوئی۔ یونانی بستی سے مُٹھ بھیڑ ہوئی تو اہل یونان سے جنگ چھڑ گئی اور آخر سکندر اعظم کی وفات کے کوئی ساٹھ سال بعد کل یونان بھی سلطنت روما میں شامل ہوگیا۔ اِسکے بعد ایشیا میں فتوحات ہوئیں۔ یہانتک کہ سلطنت روما نے سلطنت ساسانی (ایران) کے ساتھ ٹکر کھائی۔ پھر مصر۔ فرانس (گال) اور برطانیہ فتح کیے گئے۔ غرض جن ممالک کے پاؤں تک بحیرہ روم کا پانی پہنچتا ہے وہ سب اہل روما کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے لگے۔ یورپ میں شمال کی طرف دریائے ڈینوب اور دریائے رائن سلطنت کی حد مقرر ہوئے۔ ناظرین اگر نقشہ ملاحظہ فرمائیں تو وہ دیکھینگے کہ سوئٹزرلینڈ کے شمال میں ایک دوسرے کے قریب قریب یہ دونو دریا نکلتے ہیں۔ ڈینوب مشرق کو آکر بحیرہ اسود میں گرتا ہے اور رائن مغرب کو جاکر بحیرہ جرمن میں ملتا ہے۔ اِس طرح یورپ کے دو حصے ہوگئے ہیں۔

اِن دریاؤں کے جنوب میں توکل ممالک سلطنت روما کے قبضہ میں تھے اور شمال میں صرف فطرت (نیچر) کی حکومت تھی۔ سلطنت روما کی تو یہ حالت تھی کہ جابجا سڑکیں اور پُل بنے ہُوئے تھے۔ اور سڑکیں بھی ایسی مضبوط کہ آج دو ہزار سال بعد بھی اُن کے اکثر حصص موجود ہیں۔ جابجا شہر آباد۔ شہروں کے گرد فصیلیں بنی ہُوئی۔ قلعے موزُوں مقاموں پر بنے ہُوئے۔ ہر جگہ قانون کی حکومت۔ زراعت و حرفت و تجارت کا بازار گرم تھا۔ سلطنت روما کی فن معماری کے کارنامے گو ایسے مضبُوط تھے کہ آجتک جابجا اُنکے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ مگر اہل روما کی طرز معاشرت اور آئین سلطنت نے بھی لوگون کی طرز زندگی پر جو اثر کیا تھا وُہ کچھ کم دیرپا نہ تھا۔ گو سلطنت روما مِٹ گئی۔ اور اس کے بعد آجتک صدیاں گذر گئی ہیں۔ کئی خاندان بَن بنکر بگڑ چکے ہیں۔ مگر رومی طرزِ معاشرت کا نشان ابتک ان لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ سلطنت روما کی تباہی کے بعد مدت تک اِن ملکوں کی نیچرل حکومت رومی طرز پر رہی۔ ہم یہاں پنجاب و ہندوستان میں دیکھتے ہیں کہ سابقہ ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے قوانین لوگوں کا جُزو زندگی ہو گئے۔ اور لوگوں کے دماغ و عادات میں ایسے جاگزین ہو گئے ہیں کہ انہیں بیدخل کرنا سہل کام نہیں۔ یہ پُرانے قوانین اب بھی رواج عام کے نام سے یہاں نافذ ہیں۔ اور سرکاری عدالتیں مجبوراً وراثت اور دیوانی کے فیصلہ جات اُنکے مطابق کرتی ہیں۔ ایسے ہی اہل روما کی تہذیب اُنکی رعایا کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی اور زمانہ بھی کماحقہ اُسے مٹا نہیں سکتا تھا۔

جب سلطنت روما کے بُرے دِن آئے تو ایک تو سلطنتوں کی مرض الموت یعنے خانہ جنگی اور خود غرضی اراکین سلطنت میں آپسی اور شمال کی طرف سے ایک اور سیلاب اُٹھا جس نے اُس بوڑھی سلطنت کی مٹی بھی بکھیر دی اور اس طرح زمانہ وسطیٰ کا آغاز ہوا۔

یہ تو میں لکھ چکا ہوں کہ سلطنت روما خود تو آباد تھی۔ باشندے مہذب تھے۔ مگر سلطنت کی شمالی حد پر دریائے رائن وڈینوب کے پار یہ حالت نہ تھی۔ وہاں نقشہ ہی دیگر گون تھا۔ خدا کی زمین بن جتی سر بسر تھی۔ تمام ملک ایک بن تھا۔ جس میں نہ کوئی شہر تھا۔ نہ کوئی قصبہ۔ نہ کوئی سڑک نہ پل۔ نہ کوئی کھیتی نہ باڑی۔ مگر یہ سارا ملک خدا کے بندوں سے خالی نہ تھا۔ خانہ بدوش قومیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر کہیں جم کر نہ رہتی تھیں۔ آج یہاں ہیں تو کل وہاں۔ اپنے اپنے مویشی ساتھ لئے روز نئی چراگاہ میں جا پہنچتی تھیں۔ ہر قوم کی مختلف شاخوں کے علیحدہ علیحدہ سردار ہوا کرتے۔ اور ساری قوم کا بھی سردار ہوا کرتا۔ ان سرداروں کے اختیارات آجکل کے بدویوں کے سرداروں سے سمجھئے۔ ان سرداروں کی کوئی مقامی سلطنت نہ تھی۔ اسی لئے مورخوں نے ان قوموں کے کارناموں کو بادشاہوں کیطرف منسوب نہیں کیا۔ بلکہ قوم کا کارنامہ ہی لکھا ہے۔

قوم کی ہر ایک شاخ کا تو سردار ہوا کرتا تھا۔ لیکن جب ساری قوم مل کر کسی دوسری قوم کو لوٹنا یا اُن سے لڑنا چاہتی تو کل قوم میں جو شخص سب سے زیادہ لڑاکا اور جنگجو ہوتا اسے کل قوم کا سردار مقرر کر لیا جاتا۔ چھوٹے سردار اُس کے معاون و مددگار رہتے۔ اِس بڑے سردار کو بادشاہ سمجھ لیجئے۔

یہ خانہ بدوش قومیں وسط ایشیا سے چل کر بتدریج دریائے رائن وڈینوب کے کناروں تک پہنچ گئی تھیں۔ انکے دشت نورد پاؤں کو دریائے رائن وڈینوب کیا روکتا۔ وہاں تو اور انہیں آباد ملک۔ بستے شہر دکھائی دیتے تھے۔ اور یہ انہیں لوٹنے کے لئے بیتاب ہوتے تھے

(۱) پہلے ان میں سے قوم فرینک نے دریائے رائن کو عبور کیا اور اسکے مغربی کنارے پر جسے اب بلجیم کہتے ہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ پہلے تو اہل روما نے چاہا کہ انہیں مار کر نکال دیں لیکن جب اس میں کامیاب نہ ہوئے تو انکو وہاں آباد ہونے کو جگہ دے دی۔ اور انہیں اپنی رعایا تسلیم کر لیا۔ ان لوگوں نے بھی حق نمک خوب ادا کیا۔ یعنے اہل روما کے لئے یہ اپنی ہی

بھائی بندوں کے ساتھ لڑتے رہے۔ لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ ہمارا زور بازو بھی اب روما کے لیکھے کو مٹا نہیں سکتا تو مجبوراً اُنہوں نے بھی سلطنت کے حصص دبانے شروع کر دیئے

شمال کی طرف سے جرمن نسل کی قوموں نے سلطنت روما پر چاروں طرف سے حملے شروع کر دیئے۔ اہل روما نے انکی روک تھام کے لئے بیسیوں تدبیریں کیں۔ پہلے پہل تو بزور بازو انکو روکتے شکستیں دیتے۔ ساری ساری قوم کو قتل کر ڈالتے۔ مگر ان وحشیوں کو تو روما کی تقدیر پیچھے سے دھکیل رہی تھی۔ یہ لوٹ کر جانے کا نام ہی نہ لیتے۔ سب کے سب کٹ مرتے۔ ساری قوم کھیت رہتی۔ مگر لوٹ کر کوئی نہ جاتا۔ اور اگر کوئی قوم واپس بھی گئی تو اگلی سال اس سے دوگنی ہو کر آئی۔ اور بجد وجہد سلطنت روما میں اپنے لئے جگہ نکال ہی لی۔ جب اہل روما دیکھتے کہ زور سے کچھ کام نہ نکلا تو نرمی سے کام لیتے۔ انہیں اپنی رعایا بنا تے حقوق عطا کرتے۔ انہیں فوجوں میں نوکر رکھتے۔ فوجوں کی افسریاں دیتے۔ اپنے شہروں میں رکھ کر مہذب بنانا چاہتے۔ مگر وُہ لوگ پھر بھی علیحدہ کے علیحدہ ہی رہتے۔ جو قوم ایکدفعہ آگئی وُہ لوٹ کر نہیں گئی۔ غرض ان وحشیوں نے جب سلطنت روما پر حملے شروع کئے ہیں۔ تو انکی مفصلہ ذیل قومیں دریائے رائن و ڈنیوب کے شمال میں ان مقامات پر آباد تھیں جنکی موجودہ نام اُنکے مقابل لکھے گئے ہیں۔

(۱) قوم فرینک۔ ملک بلجیم کے شمال میں۔

(۲) قوم فریسی اور قوم سیکسن۔ مُلک ہالینڈ میں۔

(۳) قوم الیمانی۔ صُوبہ بیڈن میں۔

(۴) قوم برگنڈین۔ صُوبہ بویریا میں۔

(۵) قوم مارکومانی۔ صُوبہ سکسنی میں۔

(۶) قوم ونڈال۔ عہد وہ کے درمیان۔

(۷) قوم انگلس۔ شہر ہمبرگ کے شمال کو۔

(۸) قوم جوٹ - ملک جٹ لینڈ میں -

(۹) قوم لمباڑو - دریائے اوڈر کے شمالی کنارے پر -

(۱۰) قوم ونیڈی - دریائے وسچولا کے شمالی کنارے پر -

(۱۱) قوم وسی گاتھ - دریائے ڈینوب اور دریائے نیسٹر کے درمیان -

(۱۲) قوم آسٹرو گاتھ - دریائے نیسٹر اور نیپر کے درمیان -

(۱۳) قوم ہنز - بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر کے درمیان -

(۱۴) قوم مغیار (مغ) دریائے والگا کے منبع کے قریب -

یہہ تو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ قوم فرنیک سلطنت کے ایک کونے میں دبکی پڑی تھی -
اسے تو وہاں رہنے دیجئے وہ تو تا حال کسی حساب میں نہیں ہیں -

قوم ونڈال - ہسپانیہ ۴۰۵ء میں قوم ونڈال اور اس کے بھائی بند سوی - برگنڈین
الن وغیرہ دریائے رائن کو عبور کر کے صوبہ گال میں داخل ہو گئے - گو انکو زکیں بھی ملتی رہیں
مگر یہ لوٹ کر جرمنی کو نہیں گئے - کچھ تو فرانس میں آباد ہو گئے - اور باقی ۴۰۹ء میں اپنے سردار
جنسیرک کے ساتھ کوہ پرنیز کو عبور کر کے ملک ہسپانیہ میں پہنچے جہاں اُنہوں نے سلطنت
قائم کرلی - مگر یہ سلطنت چند روزہ ہی تھی - کیونکہ قوم گاتھ نے انکو ۴۱۶ء میں ملک ہسپانیہ سے
نکالدیا - تو اُنہوں نے افریقیہ میں بود و باش اختیار کرلی - اور وہاں ایک سلطنت قائم کرلی - یہ سلطنت
بھی ۵۳۴ء میں ختم ہو گیا -

قوم وسی گاتھ - ہسپانیہ الرک فاتح روما کی مرگ پر اُس کی قوم گاتھ نے اٹلی کو چھوڑا
اور مغرب کو چل کر ۴۱۶ء میں جنوبی فرانس اور ہسپانیہ سے قوم ونڈال کو نکال وہاں ایک
علیحدہ سلطنت قائم کرلی - اس وقت سے ملک ہسپانیہ کی تاریخ بالکل علیحدہ ہو گئی ہے -
اور یوروپ کی عام تاریخ میں اس سے چنداں پیچیدگیاں نہیں پیدا ہوتیں - کیونکہ ملک
ہسپانیہ اسی خاندان کے قبضہ میں رہا - یہانتک کہ ۷۱۱ء میں مسلمانوں نے اس ملک پر قبضہ کرلیا

اور جنوبی فرانس میں جسقدر مُلک قوم وسی گاتھ کے ماتحت تھا وہاں سے قوم فرینک نے اُن کو ۵۰۷ء میں مار کر نکال دیا تھا - اِس لئے قوم گاتھ اور باقی یوروپ میں کوہ پرنیز حائل ہوگیا اور یہ لوگ بالکل الگ تھلگ رہے - قوم ونڈال تو یورپ ہی سے نکل چکی تھی - اسکو تو یورپ سے پھر چنداں تعلق ہی نہیں رہا -

قوم اسٹروگاتھ - مُلک اٹلی قوم اسٹروگاتھ میں سے ایک شخص آوڈیکر نے سلطنت روما کا نشان صفحہ ہستی سے مٹایا تھا - یعنے آخری بادشاہ کو معزول کرکے خود تاج و تخت سنبھال لیا تھا - اُس نے اٹلی - سوئیٹزرلینڈ و آسٹریا لیا - پر ۴۷۶ء سے ۴۹۳ء تک سلطنت کی - لیکن اِس سلطنت آسٹروگاتھ کو سلطنت قسطنطنیہ نے ۵۵۳ء میں فتح کر لیا - اور ملک اٹلی میں اپنا ایک گورنر (اکس آرک) مقرر کر دیا - گو سلطنت قسطنطنیہ دو صدیوں تک گورنر مقرر کرتی رہی مگر ان اکس آرکوں کی حکومت کچھ وسیع نہ تھی - بلکہ صرف بحیرہ اڈریا تک کے ساحل تک انکی حکومت محدود رہا کرتی اور شہر روینا انکا دار السلطنت ہوا کرتا تھا -

قوم لمبارڈ - مُلک اٹلی اِس زوال سلطنت کی وجہ یہ تھی کہ ۵۶۸ء میں قوم لمبارڈ کے بادشاہ آلبین نے اٹلی کا کچھ حصہ فتح کرکے شہر پے ویا کو اپنا دار السلطنت قرار دیا - قوم لمبارڈ کا اثر بتدریج کل ملک اٹلی پر پہنچا - اور مدتوں تک اٹلی کے امرا اِسی قوم کے تھے - گو قوم لمبارڈ کی سلطنت کا خاتمہ ۷۷۴ء میں قیصر شارلیمن نے کر دیا - مگر اُس نے بھی مجبوراً تمام اٹلی کو اسی قوم کے قبضہ میں رہنے دیا - امرا سب یہی تھے - صرف فوج قیصر کی ہوا کرتی تھی -

اِس کے علاوہ روما خاص میں پوپ کی حکومت تھی -

مُلک اٹلی و ہسپانیہ کی تاریخ تو درج ہو چکی - اب فرانس - سوئیٹزرلینڈ - آسٹریا اور جرمنی - اِن ممالک کی تاریخ لکھنا باقی ہے - کیونکہ صرف یہی ممالک اسوقت آباد تھے - باقی شمالی یوروپ تو سب خانہ بدوشوں کی جاگیر تھا - اور ڈینوب کے جنوبی ممالک سلطنت قسطنطنیہ کے زیر نگین تھے -

قوم فرینک - مُلک فرانس	سوئٹزرلینڈ	اسٹریا	جرمنی

قوم فرینک جو اسوقت تک

ملک بلجئم میں پڑی تھی جب اُس نے دیکھا کہ سلطنت روما کے یار لوگوں نے حصّے بخرے کر لئے ہیں تو اُنہوں نے بھی اپنے حصّہ کی فکر شروع کی - ۴۸۱ء میں اِس قوم کا بادشاہ کلوڈس مقرر ہوا تھا - اس شخص نے پہلے ۴۹۱ء میں قوم آلیمانی کو زیر کیا اور جس حصّہ ملک کو وُہ اپنی جاگیر سمجھ رہے تھے وہاں تسلّط جمایا - پھر ۵۰۰ء میں سلطنت برگنڈی کو شکست دی آخر یہ سلطنت اِس بادشاہ کی اولاد کے قبضہ میں آئی - پھر ۵۰۷ء میں اُس نے قوم وسی گاتھ سے جنوبی فرانس فتح کر لیا - اِس طرح پر وُہ کل ملک جسے اب فرانس کہتے ہیں اور بلجیم وغیرہ اس ایک شخص کی سلطنت میں شامل ہو گئے - کلوڈس مذکور ۵۱۱ء میں مر گیا اس کی اولاد میں سے تھیوڈورک بادشاہ نے ۵۳۰ء میں سلطنت تھیورنجیا کو فتح کیا - اور دریائے ویسر واقع جرمنی سے کوہ پرنیز تک اور خلیج بسکے سے بویریا کی مشرقی حد تک (یعنے پرشیا کے سوائے کُل جرمنی - آسٹریا - سوئیٹزرلینڈ - فرانس - ہالینڈ - بلجیم) کل یورپ فرینک قوم کے اور شاہانِ خاندان کلوڈس کے قبضہ میں آ گیا - اِس شاخ کو خاندان میروونجین کہتے ہیں - یہ خاندان ۴۸۱ء سے ۷۵۱ء تک حکمران رہا -

اِس خاندان کے زوال کے وقت اُنکے داروغہ محلّات نے سلطنت دبالی اور آخری بادشاہ کو معزول کر دیا - اِس داروغہ کی اولاد کو خاندان کارولنجین کہتے ہیں - خاندان کارولنجین میں سے بادشاہ شارلیمین اعظم جس نے ۷۶۸ء سے ۸۱۴ء تک سلطنت کی بڑا مشہور ہے - اِس شخص نے پوپ کی استدعا پر قوم لمبارڈ سے تمام شمالی اٹلی کو فتح کیا - اور کچھ حصّہ ملک پوپ کے نذر کر دیا - جسکے صلہ میں پوپ نے اُسے قیصر روما کا خطاب عطا کیا - قوم فرینک کی کل سلطنت تو پہلے ہی اس کے قبضے میں تھی - اب اٹلی بھی اُنکے قبضہ میں آ گئی - مگر مورّخ شارلیمین اور اس کے بعد کے بادشاہوں کو قیصرانِ جرمنی کے نام سے موسُوم کرتے ہیں - اور پوپ روما شارلیمین کو قیصر کا خطاب دینے کی بنا پر اپنے آپ کو آجتک تاج بخش سمجھتے ہیں - ورنہ اس کے پہلے پوپ نے کبھی دعوٰی نہیں کیا تھا کہ میں بادشاہ ہوں

کو معزول یا مقرر کر سکتا ہوں - اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد عجب دھاندلی مچ گئی - جس شخص نے پوپ کو خوش کر لیا - اُسی نے قیصر کا خطاب پالیا - الغرض ان تمام ممالک مذکورہ پر خاندان کارولنجین سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۹۱۱ء تک حکمران رہا - سنہ ۹۱۱ء میں مشرقی ممالک یعنی آسٹریا اور جرمنی علیحدہ ہو گئے - اور اس کا نام سلطنت جرمنی مقرر ہوا - سنہ ۹۸۷ء میں مُلک فرانس میں سے بھی اس خاندان کی سلطنت منقطع ہو گئی - اور مُلک فرانس کی تاریخ بھی جُدا ہو گئی ؂

جامیؔ - یہ حکایت اُن حالات میں سے لی گئی ہے جو کتاب "مشاہیر اسلام" میں حضرت مُلّا جامی صاحب کی بابت لکھی ہیں :- حضرت مُلّا جامی رحمۃ اللہ علیہ سلطان ابوسعید غفر اللہ لہٗ کے پاس ایکدن تشریف لیجا رہے تھے - راستہ میں نُدمائے شاہی میں سے ایک شخص ملا اُسنے حضرت سے عرض کیا کہ اسوقت بادشاہ سلامت بزم عیش و عشرت میں سرگرم ہیں اور رحیق کا دَور دورہ ہے ! مُلّا صاحب سُنتے ہی اپنے کاشانۂ سعادت کو لوٹ گئے - اِدھر یہ خبر بادشاہ کو لگی کہ حضرت جامی تشریف لاتے تھے مگر راستہ ہی سے گھر کو پلٹ گئے ہیں - سُنتے ہی تمام آلاتِ طرب و مُطربین کو اپنی مجلس سے اُٹھوا دیا اور لہو و لعب موقوف کر کے ایک مصاحب کے ذریعہ سے عرض کرا بھیجا کہ میں آپ کے قدم رنجہ فرمانے کا انتظار کر رہا ہُوں -

مُلّا صاحب نے بجواب اس کے ایک غزل رنگین فی البدیہہ لکھ کر ابوسعید کی خدمت میں بھیجدی جس کے یہ دو شعر مُلّا صاحب کے حُسن اخلاق و حسن تنبیہہ کو بیان کرتے ہیں :-

نہ زُہد آمد مرا مانع ز بزمِ عشرت اندیشاں ۔۔۔ غمِ خود دُور میدارم ز بزمِ عشرت ایشاں

بجائے اطلس شاہاں نہ شاید فرش رہ حاشا ۔۔۔ کہ راہِ قُرب بایہ دلقِ گرد آلودِ درویشاں

اسمٰعیل (از علیگڈھ)

دلوں کے کھوٹ

دلوں کے کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

فطرتِ انسانی کا جو پُرملال فوٹو شاعر نے مندرجۂ عنوان شعر میں کھینچا ہے اسکو دیکھ کر بہت کم اشخاص ایسے ہونگے جنکے دِل میں پُرتاسّف خیالات پیدا نہ ہوجائیں اور افسوس بھی کئی قسم کا ہوگا۔ کِسی کو کوئی خاص واقعہ مطابقِ شعر یاد آتا ہے کوئی ہمدرد بنی نوع انسان انسان کی گری ہوئی حالت پر افسوس کرتا ہے اور چُپکے ہی چُپکے یاس و الم کے سمندر میں غوطے کھاتا ہے۔ مگر ایسے پڑھنے والے کم ہونگے جو کہ شعر پر کچھ دیر غور کرکے اس کی حقیقت کی طرف رجوع کریں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے مُلک میں شعر کے معنے کی تہ تک پہنچنے کا شوق ابھی پُوری طرح پیدا نہیں ہوا۔ شاعر عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ مشاعرہ میں غزل پڑھ لی۔ تو انکے کلام کی کماحقہ قدردانی ہوگئی۔ کوئی لفظی صنعت رکھ دی اور داد لے لی۔ کوشش ہمیشہ صلہ اور انعام پر منحصر ہوتی ہے۔ جب لفظی صنعتوں کا صلہ بھی بآسانی ملجائے تو تعجب نہیں کہ سوائے باکمال استادوں کے اکثر اہلِ سخن کے کلام میں الفاظ کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ ہاں مستند شعرا کے دیوانوں میں بہت سے شعر دستیاب ہوتے ہیں جن پر غور کرنے سے انسانی خیال دُور کی خبر لاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم عنوان کے شعر پر غور کرتے ہیں۔

کیا شاعر کے دِل میں شعر کہتے وقت اِسکے سوا اور کچھ نہ تھا کہ رفیقوں کو رفیقوں کی طرف سے بدگمانی ہوتی ہے کہ دُنیائے دُوں محض نفسی نفسی کا سبق پڑھے ہُوئے ہے۔ کہ انسان ایک دُوسرے سے بجائے محبت و اُنس کرنے کے حسد

بغض کرتے ہیں۔ کہ بشر بجائے بے شر ہونے کے باشر بنا ہوا ہی شاعر کا مطلب بیشک یہ بھی تھا مگر ایسے معمولی مطالب تک اس مطلب کو محدود کرنا نفسِ مضمون سے گریز کرنا ہے۔ شعر کہتے وقت شاعر کی آنکھوں کے سامنے مختلف طبقات سوسائٹی کا ایک دردناک نقشہ پھر گیا ہوگا۔ شاہ سے گدا تک اس کی نظر سے گذرتے ہونگے اور سب کو وہ یہی کہتا ہوگا کہ

دلوں کے کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

زیادہ وضاحت کے لئے ہم ناظرین سے التجا کرتے ہیں کہ اپنے تصور میں ایک شاہی دربار کا سماں باندھیں۔ مصاحبین پر بجائے خود غور کریں اور پھر انکا رشتہ تعلق شاہ کے ساتھ دیکھیں۔ کیا ایک سے ایک نہیں جلتا؟ کسی کا منصب۔ کسی کا حسن۔ کسی کی لسانی دوسروں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح نہیں کھٹکتی؟ گاہ و بیگاہ کیا وہ ایکدوسرے کیطرف سے شاہ کے کان نہیں بھرتے رہتے؟ اور خود شاہ کا قلب ہی کیا بالکل لوثِ دنیا سے پاک اور آلائش روزگار سے مبرا ہے؟ کسی کا مال تو کسی کی عزت کیا اسکی نگاہ میں نہیں ہیں؟ اور اگر یہ سب سچ ہے تو کیا شاعر نے ہمارے سامنے اُن کے دلوں کو کھول کر نہیں رکھدیا؟ یہ مثال تو انسانی شوکت کے اعلیٰ درجہ کی تھی اب ادنیٰ طبقہ کی طرف آئیے۔

کیا ایک بھیک منگا دوسرے کو خیرات پاتے ہوئے دیکھ کر جی میں نہیں کڑھتا؟ کیا فقیر ہر وقت فقر قناعت اور ریاضت کا جامہ پہنے رہتے ہیں؟ سخی سے کیا ہمیشہ فقیر خوش ہی جاتے ہیں؟ سب جوگی ستی اور سب تارک الدنیا خدا پرست ہی ہوتے ہیں؟ کیا عدل و انصاف کی کچہریاں اس نفسانیت سے بری ہیں؟ دیکھئے! مدعی۔ مدعا علیہ۔ انکے وکیل۔ محرر۔ اردلی ہر اک اس فکر میں ہے کہ دوسرے کو دامِ تزویر میں لاؤں۔ جج اگر متدین بھی ہو تو کم از کم اس سوچ میں ہے کہ جلدی سے گھر جاؤں۔ اور پولیس اس

واؤں میں کہ ہو سکے تو سب کو چکما دے - ایسے وقت میں اگر کوئی کامل سب کی چشم بصیرت سے
ودغرضی کا پردہ ہٹا دے تو کیا وُہ ایک دُوسرے کو قابلِ عزت سمجھینگے ؟

کوئی اور مثالیں لیجئے - کیا زید ایک ادنیٰ چیز گم ہونے پر اپنے عزیز دوست عمرو کو نگاہ بدگمانی
ے نہیں دیکھتا اور دل ہی دل میں اُسکے افعال و اقوال کو نہیں پرکھتا ؟ زید کا نیا دوست بکر
یا عمرو کی نسبت بدگمانی میں شریک نہیں ہوتا ؟ کیا عمرو کے شیشۂ دل کو ٹھیس نہ لگیگی ؟ ریل
ڑی میں بیٹھے ہوئے مسافر کیا اپنی خوش گپی میں بھی ایکدوسرے کی نسبت دل ہی دل میں
و ظنی نہیں کرتے ؟ کیا میزبانی اور مہمانی جیسے نازک پیار بڑھانے والے موقع پر بھی بعض
ی باتیں نہیں ہوتیں جو بہتر ہے کہ جانبین کے دلوں میں ہی رہیں اور زبانِ قلم سے نہ نکلیں ؟

پاک سے پاک اوقات میں نفس انسانی پر غور کیجئے - معبدوں مندروں مسجدوں اور گرجاؤ
ے اُن حصوں میں جہاں عبادت ہو رہی ہے نظر غائر سے دیکھئے - کیا دل کانپ نہیں اُٹھتا
ب کر ایک ہی جگہ اور ایک ہی خدا کے حضور میں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اور سر جھکا جھکا کر آرزو
نے والے ایک دُوسرے کی بیخ کنی کی دُعا میں مصروف ہوں ؟ واعظ کا اپنے فرقہ کی حالت
دن دیکھ کر جگر تو تھرّاتا ہے مگر اتنا تامل کیجئے کہ جسوقت وہ رومال بدست چشم پُرنم کی
لیری کر رہا ہے تو کیا اُسوقت اُسکا سخن بالکل بے لاگ ہوتا ہے اور صفائی قلب پر مبنی ہے ؟
طرح غور سے دیکھیے تو شاعر کا قول کسی نہ کسی وقت میں دُنیا کے ہر بشر کی اندرونی حالت پر صادق
ہو - گو دلوں کی تاریکی کی انتہا تو سوائے عالم الغیب کے کسی کو معلوم نہیں - مگر جتنی تاریکی
ہر بھی ہو جاتی ہے - اس قول کے ثبوت کے لئے وہ بھی بہت کافی ہے -

مذکورہ بالا مطلب تو یہی ہے - ذرا اور عمیق نظر سے دیکھیں تو اور بھی گہرے معنے نکلتے
ں - انسانی تعلقات میں دروغ کی مصلحت آمیزی اور راستی کی فتنہ انگیزی کی حقیقت کو
ی شعر کے ایک لفظ "اگر" میں بھر دیا گیا ہے - ہر فرد بشر سمجھ سکتا ہے کہ انسان ہر وقت لفظی
سے کام نہیں لے سکتا - اسکو انجام کار پر غور کرنا پڑتا ہے اور ہزاروں معاملات کی

پیچیدہ گیاں اسکو شش و پنج میں ڈالتی ہیں۔ اور اسی لئے دلوں کے کھوٹ برملا نہ کہنے میں یعنے بعض اوقات راستی فتنہ انگیز کو چھپانے میں ایک حکمت ہے۔ اِسی پر ارتباط کی بنا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کل سلسلہ کاروبارِ انسانی منقطع ہو جائے اور سوائے اسکے کہ ہم ایک دُوسرے کو نگاہِ تنفر سے دیکھیں اور کچھ نہ ہو۔ رازداری وُہ شے ہے جس کی ہر دوست اپنے دوست میں قدر کرتا ہے۔ مگر کیا رازداری کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کہ دِل کی باتوں کو برملا نہ کہا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اخفا اور چشم پوشی خاص خاص موقعوں پر اعلیٰ نیکیوں میں ہیں۔

سب سے زیادہ ضروری اور قابلِ قدر معنے اِس قول کے یہ ہیں کہ جہاں انسان پر لازم ہے کہ اپنی جبلّی شرافت کو مدنظر رکھ کر ہمیشہ کارِ خیر میں مصروف ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وُہ اپنے طبعی لوث کو نظرانداز نہ کرے اور اس بات کو خوب ذہن نشین کرے کہ جس طرح شیرینیِ کلام اور حُسنِ اخلاق غیر کو اپنا بنا دیتے ہیں اسی طرح ایک اور چیز بھی ہے جو کہ اپنوں کو اپنوں سے چھڑواتی ہے اور یہ چیز صرف دلوں کا کھوٹ نہیں بلکہ دلوں کے کھوٹ کا برملا کہنا ہے۔ پس اپنوں کو عزیز اور غیروں کو حلقہ بگوش کرنے والی دو چیزیں ہیں اوّل صداقتِ دِل اور دوم رازداری اِس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ دو نصیحت کی باتیں عام ہیں مگر اِس شعر کے ذریعہ سے ان نتائج تک پہنچنا عام نہیں۔ ظاہرا تو یہ شعر دُنیا کی اُداس تصویر دکھاتا ہے اور ہر ایک اس کو سچ جانتا ہے مگر جب تک اس سچ کو نگاہ غور سے نہ دیکھا جائے اس کا دُوسرا اور فلسفیانہ نصیحت کا پہلو نہیں سُوجھتا اور پڑھنے والا کلامِ شاعر سے پُورا مستفیض نہیں ہوتا +

عبد العزیز

مُطالعۂ الفاظ

(۲)

معمُولی سے معمولی الفاظ بھی جو روزمرہ کے استعمال سے اپنی چمک دمک کھو بیٹھتے ہیں ایک نگاہِ غور سے دیکھنے پر نظم کی خُوبیوں کا مخزن نظر آئینگے - اور اگرچہ ہر وقت کی مصاحبت سے ظاہر بینوں کے لئے اُن کی آبداری میں فرق آگیا ہے - پرکھنے والی آنکھیں اب بھی اُنکی وُہی آب و دیکھتی ہیں جو وضع کرنے والے نے اُنکے لئے سوچی تھی -

نازک خیالی نے عاشق و معشوق کے انداز کو دلبری اور دلربائی کے پیرایہ میں دلچسپی کا مرکز بنا دیا ہے - پیرایہ کی اپنی کاٹ چھانٹ اپنی خوش اسلوبی سے دلوں کو بے بس کر کے اپنی طرف کھینچ رہی ہے - دل دیکر دل لگی کے دل ہی دل میں مزے لیتے ہیں - اور اس پر جان تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں - اور اس طرح ہمارا دلبر دل لیکر ہماری جان کا مالک بلکہ خود ہماری جان بن جاتا ہے - اور جاناں کے پیارے نام سے ہمارے مُردہ جسم میں ایک تازہ رُوح پھُونک دیتا ہے -

اس میں شک نہیں کہ نازک خیالی نے شعر کی زمین کو اپنی سحر نگاری سے رشکِ جنت بنا کر اس تیرہ خاکدان کے رہنے والوں کو دُور دُور کے جلوے دکھا دیئے ہیں - مگر اسکی فیاضی نے ہماری مٹھی بھر خاک کے لئے زمین کی قید سے آزاد ہو کر بھی ہوا کے پانو باندھ کر چھوڑے ہیں - اور بادپا کی صُورت میں اس کی باگ حضرت انسان کے ہاتھ میں ابدالآباد تک دے دی ہے - افسوں گری اتنی ہی نہیں بلکہ کمال تو یہ ہے کہ سوار کی ایڑی ملی تو ہوا ہے اور باگ رُکی تو کوہ -

اس مضمون کے پہلے حصہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ الفاظ اکثر اخلاقی حقائق کے

شاہد ہوتے ہیں۔ اللہ جل شانہٗ نے الفاظ پر ایسی مُہرِ صداقت لگائی ہوئی ہے کہ انسان اتنے حقائق سے آگاہ نہیں جتنے شب و روز وُہ زبان سے نکالتا رہتا ہے۔ انسان بڑے بڑے زبردست اصُول زبان سے بیان کرتا ہے اور بعض اوقات بے خبری میں اپنے برخلاف بھی سوسائٹی کا یہی معمولی چلن سمجھ کر انہیں رائج کر لیتا ہے۔ خود دُنیا کے لئے جو لفظ ہماری زبان پر جاری ہے ہمیں بتا رہا ہے کہ اِسکے ساتھ دِل لگانا جایز نہیں۔ اور ہم ہیں کہ دِن رات اُسکے دھندوں میں پھنسے ہُوئے اسکی حقیقت کو سوچتے تک نہیں۔ دُنیا کو سینجی سرائے کے نام سے ہم یاد تو کرتے ہیں لیکن اُسکا مفہوم ہم نے فراموش کر دیا ہے۔ سینجی یا اسینجی اصل میں اسپانجا یعنے ایک سرائے ہے اور وہاں بھی ہمارے قیاس کے مطابق اِنسان کا تو کیا ذکر گھوڑے باندھنے کی جگہ سے زیادہ آرام کی اُمید نہیں۔ اور کم سے کم سرائے ہونے کی صُورت میں بھی اس جگہ ہمارا قیام چند روزہ اور یہاں کے کُل سامان گذاشتنی۔ اگر ہم دنیا کی حقیقت جو اسکے نام اسینجی سے ظاہر ہے ذہن نشین کر لیں تو پھر ہمارے عیش و عشرت کے لیے بھی انکی اصلی معنوں کے مطابق وُہی سامان کافی ہونگے جو ایک مُسافر خانہ میں ٹھہرنے والے مُسافر کے واسطے چند روزہ قیام کے لئے ضروری ہیں۔ یہاں ہم اپنے دِل کی خوشی کے لئے چاہے کچھ ہی سامان کریں اور انہیں عیش و عشرت کے جُزو قرار دیں مگر ہماری اپنی زبان ایک زبردست ناصح ہے اور ہمیں بار بار بتا رہی ہے کہ ہماری منزلِ مقصود یہاں سے کہیں دُور اور ہماری اصلی تسکین اور ہمارے مدامی قیام کی جگہ کوئی اور ہی ہے۔

ہماری غفلت نے دُنیا کی ناپائداری کو یہاں تک ہمارے ذہن سے غیر مانوس کر دیا ہے کہ زبان تو اسکی حقیقت کا اعلان کر رہی ہے اور ہمارا دماغ اُس کی اصلیت سے ایسا ہی ناآشنا ہے جیسے کہ خود دُنیا مداومت سے۔ محویت جو ہمیں اس میں اور اس کی چیزوں میں ہو جاتی ہے ہماری اخلاقی حالت ملیامیٹ کر دیتی ہے۔ دُنیا کے تعلّقات

ہیں ہماری حد سے زیادہ دلچسپی اور سرگرمی طبعی شرافت اور عظمت کی بربادی کا باعث ہوتی ہیں - جوں جوں ہمارا انہماک اس طرف زیادہ ہوتا ہے ہماری ملکوتی صفات نابود اور بہیمی عادات موجود ہو جاتی ہیں - کعبہ دل دیو لعین کا مسکن و ماوی بنجاتا ہے - اور دل کی خواہشیں بدیوں کی صورتوں میں ہمیں پسند آنے لگتی ہیں - کسی سے دشمنی کرنا یا رکھنا ہمارا ہر روز کا مشغلہ ہے - اور صرف مشغلہ ہی نہیں بلکہ فخر کی بات ہی لیکن ہم نہیں سمجھتے اور زبان برابر سمجھا رہی ہے کہ دشمنی سے ہماری کون سی خوبی ظاہر ہوتی ہے - دشمن وہی دشٹ "من" ہے اور اس صورت میں سوائے اسکے کہ ہمیں دشمنی سے شرم آئے اور کوئی بات بن نہیں آتی - دشٹ تو بد ہے اور من دل کو کہتے ہیں گویا کسی سے دشمنی رکھنا اپنے دل کی بدی کی دلیل ہے -

بعض محققین کی رائے میں لفظ پارسا اخلاقی حقایق عبرت آمیز انداز سے ظاہر کرتا ہے - جوانی کی امنگیں پرہیزگاری سے رم کرتی ہیں اور جوانی کے ولولے خدا پرستی سے کوسوں بھاگتے ہیں - پارسائی اور شباب ضدین ہیں جنکا اجتماع ناممکنات سے گنا جاتا ہے - لیکن بڑھاپا پارسائی لے آتا ہے اور حقیقت میں پارسائی میں بڑھاپا نظر آ رہا ہے - پار (پرانا) سا (جیسا) بڈھوں کا سا ہونا چاہئے اور پارسائی جوانی میں بھی بڑھاپے کے خواص پر کھلے لفظوں میں دلالت کرتی ہے -

زبان تاریخ متبحر بھی ہے - لفظ ترک پر ہی غور کرو - اس ایک لفظ میں کتنے تمدنی اور قومی انقلابات اور جذبات نظر آ رہے ہیں - ترک جنکی قابل فخر یادگاریں آجتک سرحد یورپ میں موجود ہیں - خوش رو اور خوش اندام لوگ تھے - انکا زاہد فریب حسن انکی معشوقانہ ادائیں ایک عالم کو گرویدہ کئے ہوئے تھیں - اور انکے حسن کے ساتھ ساتھ ہی انکی شجاعت نے چار دانگ دنیا میں اپنا سکہ جمایا ہوا تھا - انکے دلیرانہ حملوں نے دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا - انکے دھاوے حیرت انگیز اور وحشت خیز تھے - اور ان کی

ناشنہ زبان سے سُننے والے کا دِل دہل جاتا تھا۔ اب بھی ترک معشوق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور قوم ترک کے دلاویز حُسن کا شاہد ہے۔ ترکتازی تا ایں دم ترکوں کے حملے اور اُنکے دِل ڈرانے والے دھاوے یاد کراتی ہے۔ اور اب بھی ہم ترکی کا جواب ترکی میں دینے کا حوصلہ جو کر لیتے ہیں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وُہ ترک جنکی ترکی کا رُعب دوسرے کو گونگا کر دیتا تھا سامنے نہیں۔ ترکوں کے ساتھ ساتھ اُنکا خوانِ یغما بھی آجتک اُنکی دستبرد کا شاہد ہے۔ اور اگرچہ اسکی مہیب صُورت نے اب دلچسپی کا پیرایہ اختیار کر لیا ہے۔ دیکھنے والے صدیوں کے زنگاری پردہ میں بھی خوانِ یغما کی تاراج کی ہیبت ناک تصویر دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔

کمانِ کیانی۔ تاریخِ ایران کا وُہ زمانہ ہمارے سامنے لے آتی ہے جسکی نظیر ایران کو پھر دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ کیانی شوکت۔ کیانی رُعبِ حکومت۔ کیانی جاہ و جلال کیانی کمان سے ظاہر ہے۔ ایران کے خسروانِ کے کا عہدِ سلطنت ایران کی ترقی کا کفیل تھا۔ اس عہد میں ایران نے ہر ایک فن میں جو کسی مُلک۔ کسی قوم۔ کسی سلطنت کے عروج کا باعث ہوتا ہے کمال حاصل کیا تھا۔ اور فن جنگ میں تو بالخصوص ایرانی پہلوانی اور ایرانی تیراندازی نے دوسری قوموں کو وُہ نیچا دکھایا کہ رستم و افراسیاب آج تک بے عدیل اور کمان کیانی لاثانی سمجھے جاتے ہیں۔

اسی طرح اُستاد بھی پُرانے زمانہ کی یادگار ہے۔ ایران میں ایک زمانہ وُہ تھا کہ پڑھنا اور پڑھانا 'اُستا' پر موقوف تھا۔ اُسکا جاننا اور پڑھانا ہی اُستادی کا حق قائم کر دیتا تھا۔ اور غالب قیاس ہے کہ اسکے سوا اور کچھ پڑھنے یا پڑھانے کے لئے تھا بھی نہیں 'اُستا' 'دو' (جاننا) اب اُستاد کی صُورتیں آتش پرستوں کی مقدس کتاب 'اُستا' کو پڑھاتی پڑھاتی اسلامیوں کی کتاب اللہ پڑھانے پر مامور ہو گیا ہے اور اسی عزت و توقیر کی نگاہ سے مسلمانوں میں دیکھا جاتا ہے جس سے آتش پرست لوگ صدہا سال گذرے کہ اسکی 'استا' دانی کے لئے اُسے دیکھتے تھے۔

احمد دین

عُمر خیّام

مُبارک تھا ایران کا وُہ زمانہ جس میں عمر خیّام جیسے روشن خیال اور عالی دماغ لوگ اس سرزمین سے پیدا ہوتے تھے۔ اِس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ خاکِ ایران ہمیشہ سے مردم خیز رہی ہے اور تہذیب اور تمدن کے لحاظ سے ممالک مشرقی میں ہر طرح ایشیا کا فرانس کہلانے کی مستحق ہے تاہم اب اس سرزمین کا زور اور ایشیائی ممالک کی طرح گھٹتا ہُوا معلوم ہوتا ہے اور آجکل اُس میں بھی قابلِ فخر لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں یا اگر ہوتے ہیں تو زمانہ حال کے ضروریات کے مطابق نہیں ہوتے۔ جن پر حافظ اور سعدی جیسے لوگوں کے مولد و مدفن کو ناز ہو سکے۔

عُمر خیّام اپنے وقت کا ایک قابل ترین محققِ علم ہیئت و ریاضی و حکمت ہونے کے علاوہ ایک بے عدیل شاعر گذرا ہے اور اُس کی شاعری میں زیادہ تر قابلِ تعریف یہ بات ہے کہ اس میں ہر جگہ اور ہر مقام پر فلسفیانہ حکمت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہُوئی ہے جو انسان کو اپنی حقیقت جاننے اور قُدرت کے مطالعہ کرنے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اُسکا کلام صرف ظاہری حُسن پرستی اور جام و شراب ہی کی رنگ آمیزیوں سے پُر نہیں بلکہ اس میں انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو پر ایسے مختلف انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ خیام اپنی قسم کا اعلیٰ ترین شاعر مسلّم ہو چکا ہے۔

خیام کبھی قیدِ مذہب سے آزاد اور پابندئ دین سے علیحدہ ہو کر آزادہ روی اور زندہ دلی کی تعلیم کرتا ہے کبھی اپنے رندانہ وعظ و نصیحت اور قلندرانہ تلقین سے گھبرا کر اخلاق کے سچے راستہ کی طرف لاتا ہے۔ گاہے اوباشی اور مے پرستی کو اپنی حیات مستعار کا اصل منشا و مقصد قرار دیتا ہے اور کبھی شرابِ معرفت کے ذوق میں خود فراموش ہو کر رو رو کر

مناجات کرتا ہے کبھی دوزخ و بہشت کے بیم و اُمید سے نجات دیتا ہے اور کبھی باغ عالم کو سبزہ و گل اور ساغر و ساقی سے آراستہ کرکے نمونۂ فردوسِ بریں بنا دیتا ہے۔ کبھی زمانہ کی عیاری اور چرخ کی ناہنجاری کو کوستا ہے اور کبھی زندگی اور اُسکی خوشیوں کی ناپائداری سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور رفتارِ عالم اور فلک نیلوفری کے پردہ میں اسرارِ ازل اور رموزِ الٰہی کو چھپا پاتا ہے۔ غرض اُسکی تعلیم بظاہر ایسی متناقض معلوم ہوتی ہے کہ جب تک نظرِ عمیق سے نہ دیکھا جائے اُسکے اصلی مقصد اور دلی منشا کا معلوم کرنا دشوار ہے۔

خیام کی رباعیات ایک مرقع ہیں جس میں ہر ایک رباعی ایک جداگانہ تصویر ہے اور وُہ تصاویر اُن خیالات کی ہیں جو مختلف اوقات اور مختلف مواقع پر مختلف صورتوں کے لباس میں شاعر کی صفحۂ دل پر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں۔ کہ بعض بعض رباعیات ایک ہی مضمون کو مختلف رنگوں میں دکھاتی ہیں۔ مگر بلحاظ خیالات مختلف عنوانوں پر منقسم ہو سکتی ہیں۔ ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور عمیق سے عمیق اندرونی جذبات ایسی مجلا زبان میں جلوہ افگن ہوئے ہیں کہ گویا پریاں شیشہ میں اُتر آئی ہیں۔ ہمارے مُلک کے لئے بیحد فائدہ کی بات ہو۔ اگر کوئی صاحبِ ہمت اِس مختصر مجموعۂ رباعیات کو بحیثیت خیالات تقسیم کرکے اسکی ذہانت کے ابرِ نیساں کی خودرَو پیداوار کو بلحاظ رنگ و بُو ایک سلیقہ سے باقاعدہ کیاریوں میں سجائے۔

ہر ایک انسان کی دلی خواہش ہے کہ اُس کی زندگی جہانتک ممکن ہو عیش و آرام سے کٹے اور کسی طرح کے رنج و تکلیف کا اُسکو سامنا نہ ہو۔ مگر تجربہ اِس کے برخلاف ہے اور ہر شخص کے حصہ میں کچھ نہ کچھ شیرینی و تلخی ضرور آتی ہے۔ اِسلئے صرف وُہ شخص اپنی حیاتِ مُستعار کو آرام سے کاٹ سکتے ہیں ایک وُہ جو یہ سمجھ لے کہ عیش و رنج توام ہیں اور دُوسرا وُہ جسکے دِل نے کبھی یہ سوال پیدا ہی نہ کیا ہو ؎

از گردشِ ایں دائرۂ بے پایاں برخورداری دو نوعِ مردم راداں

یا باخبرے تمام از نیک و بدش یا بے خبرے از خود و از کار جہاں

مگر جس شخص کا دماغ عقل کی روشنی سے اس طرح منور ہو جیسے عمر خیام کا۔ کبھی ممکن ہے کہ اسکا دِل اندیشۂ مافات یا فکر مآل سے پاک ہو یا ہر قدم پر اس کے سامنے یہ دو سوال پیدا نہ ہوں کہ ہماری پیدائش اور زندگی کا مقصد و منشا کیا ہے اور یہ کہ مرنے کے بعد ہمیں کیا پیش آئیگی۔

ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک نقاش من از بہر چہ آراست مرا

کس را پس پردۂ قضا راہ نشد وز سرّ خدا ہیچکس آگاہ نشد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد

انواع و اقسام کے رنج و آلام سے تنگ آکر جن سے کسی فرد بشر کو بھی چارہ نہیں اور ہر طرف خیالات کے گھوڑے دوڑا کر خیام اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جہانتک ممکن ہو اپنی عمر کے ہر ایک گذرنے والے لحظہ کو بے پروائی اور مستی اور نشاط سے خوش وقت کرنا ہی عین دانائی اور غم و غصہ کو پاس نہ پھٹکنے دینا عین فراست ہے۔ کیونکہ کل کا کسی کو کچھ علم نہیں۔

خیام زمانہ از کسے دارد ننگ کو در غم ایام نشیند دل تنگ
مے خور تو در آبگینہ با نالہ و چنگ زاں پیش کہ آبگینہ آید بر سنگ

چوں عمر ہمی رود چہ شیریں و چہ تلخ پیمانہ چو پر شود چہ بغداد و چہ بلخ
مے نوش کہ بعد از من و تو ماہ بسے از سلخ بغرہ آید و غرہ بہ سلخ

چوں عہدہ نمے شود کسے فردا را حالے خوش کن تو ایں دل سودا را
مے نوش بنور ماہ اے ماہ کہ ماہ بسیار بتابد و نیابد ما را

اے ہمنفسان مرا ز مے قوت کنید ویں چہرہ کہربا چو یاقوت کنید

چوں فوت شوم بباده بشوئید مرا — وز چوبِ رزم تختۂ تابوت کنید

خیام کے مذہب میں مذہب کی پابندی کی اٹل قیدیں اور کفر و بیدینی کی بدلگامی دونوں قابلِ نفرت ہیں اور اسکا اپنا دین صلح و امن ہے اور مذہبی قیود و قواعد سے نجات اُسکی آرزو ہے۔ اور غمِ فردا محو اُسکا اصُول ہے۔ بے تعصبی اور زندہ دلی اُس کی جان ہے اور آزادی اور آزاد خیالی اُسکا ایمان۔

مے خوردن و شاد بودن آئینِ من است — فارغ بودن ز کفر و دیں دینِ من است
گفتم بعروسِ دہر کابینِ تو چیست — گفتا دلِ خرّمِ تو کابینِ من است

مگر اس مستی اور خود فراموشی کے عالم میں بھی وُہ اپنے کام کی بات ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور فطرت کے پوشیدہ رازونکو اس طرح بے خبر نکال لیتا ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔

پیش از من و تو لیل و نہارے بودست — گردندہ فلک برائے کارے بودست
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی — کیں مردمکِ چشمِ نگارے بودست

ایں کوزہ چو من عاشقِ زارے بودست — دربندِ سرِ زلفِ نگارے بودست
ایں دستہ کہ در گردنِ اُو مے بینی — دست است کہ در گردنِ یارے بودست

خیام بعض کے نزدیک اولیائے کرام میں سے سمجھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی رندی پر قطعاً نکتہ چینی نہیں کی جاتی۔ مگر ہمیں اُسکو ایک معمولی انسان سمجھکر اُس کی زندگی پر نظر ڈالنی ہے اور اُس کی بزرگی یا حُسنِ ظن کو جو عوام کے دلوں میں ہے اس میں دخل نہیں۔ اِس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے کلام میں زیادہ تر حصّہ جو ساقی و شراب اور حُسن و سبزہ کی ثناگوئی میں صَرف ہوا ہے۔ اسپر چند الفاظ لکھے جائیں۔ اوّل تو اس قسم کی تہمتوں کا اصل مقصد جو بزرگ اپنے آپ پر لگاتے ہیں یہ

وتا ہے کہ وُہ مطعونِ خلائق سمجھے جائیں اور کوئی اُنکے پاس نہ پھٹکے اور وُہ چپکے بیٹھ کر
پنے دھیان میں مصروف رہ سکیں - پھر یہ کہ شاعر کا جہاں یہ فرض ہوتا ہے کہ لوگوں کے
ندرونی جذبات یا اُنکے خیالات کا ترجمان ہو وہاں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ خاص حد
مصلح قوم ہونے کا فرض بھی ادا کرے - چنانچہ انسان خواہ کیسا ہی پاکباز کیوں
ہو گناہ اور حدودِ فطرت سے گذرنے کا تعلق اُس کی طبیعت کے ساتھ کچھ ایسا ہوتا
ہے جیسے گوشت کا ناخن کے ساتھ - اِس گناہ کی چاٹ کو شراب کی چاٹ سے
ڈھ کر کسی دُوسری چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتے - پھر جہان میں کوئی ایسا برائی
کا کام نہیں جو شراب نوشی سے تعبیر نہ ہوسکتا ہو کیونکہ اسکا اُمّ الخبائث ہونا مسلّم
ہو چکا ہے -

گُناہ کے مُرتکب ہونے پر جو ایک جوشِ شرمساری و ندامت انسانی دل
یں ہوتا ہے وُہ سرور کے بعد خمار سے کسی طرح کم نہیں ہوتا - پھر دُنیائے ناپائدار کی
گذرنے والی خوشیاں - عہدِ شباب کی ڈھلتی چھاؤں - جوانی کی اُڑ جانیوالی
منگیں - انسانی تکبّر و نخوت - دولت اور ظاہری شان و شوکت کا جھوٹا گھمنڈ - او
سکی غفلت اور بے پروائی اور اس قسم کی سیکڑوں چیزیں اگر شراب کے ناپائدا
سرور اور اُسکے عذاب دہ خمار سے مشبّہ و مشبّہ بہ نہ ہوسکتیں تو ایشیا کی نصف
اعری تو گویا نیست و نابود ہی ہو جاتی - پس ظاہر بین آنکھوں کو مشرقی شاعری کے
ستر خوان پر شراب و جام اور مینا و صُراحی دیکھ کر کچھ متحیر نہیں ہونا چاہئے - کیونکہ صرف انہی
ی برکت سے وُہ باسی کھانے باوجود دیرینہ ہونے کے صدہا سال کے بعد بھی ایسے ہی
وشگوار اور پُر ذائقہ ہیں جیسے اس وقت جب میزبان نے پہلی دفعہ اہلِ محفل کے سامنے
کر چُنے تھے - گویا شراب ایشیائی شاعری کے قوام کے لئے ایسے ضروری تھی جیسے اکثر
نگریزی دواؤں کے لئے سپرٹ کی آمیزش - قطع نظر اسکے ہزارہا سچائی اور کام کی باتیں

اسکے پردہ میں اس خوبصورتی سے کہی اور سُنی جاسکتی تھیں جیسے کوئی بچہ کڑوی گولیاں جنپر شیرینی لپٹی ہوئی ہو نگل جائے۔

پس یہ ناشکرگذاری ہوگی اگر ہم ان برکتوں اور نیرنگیوں کی جو دُخترِ رز کی رنگینیِ طبیعت نے ہماری شاعری میں پیدا کردی ہیں قدر نہ کرسکیں۔ ہاں اس بات کے ہم مُقر ہیں کہ ہر چیز کا اچھا بُرا ہونا بہت کچھ اسکے اچھے یا بُرے استعمال پر منحصر ہے اور اگر کسی نے اس شاعری کو بھی حد سے زیادہ منہہ لگایا تو اسکا جواب وہ اسکی ذات کے سوا کوئی دُوسرا شخص نہیں ہوسکتا۔

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور یا با صنمے سادہ رُخے خنداں خور
بسیار مخور۔ ورد مکن۔ فاش مساز کم کم خور گہ گہ خور و پنہاں خور

(باقی آئندہ)

دوکاندار قوم۔ نپولین بوناپارٹ شہنشاہِ فرانس نے تو اپنی فتوحات گذشتہ میں اہلِ انگلستان کو بطور طعن "دوکانداروں کی قوم" کا خطاب دیا تھا۔ اور اس سے برطانیہ کے باہمت باشندوں کی حقارت مدنظر رکھی تھی۔ مگر خدا کی شان ہے۔ کہ اہلِ انگلستان نے دوکانداری کو اس اوجِ کمال پر پہنچایا۔ کہ آج اُنکی دوکانداری پر بہت سی قوموں کو رشک ہے۔ اس قوم نے جو ترقی گذشتہ صدی میں تجارت کے میدان میں کی وُہ تو ظاہر ہی ہے۔ حال میں وہاں کے اُمراء و شرفا نے تجارت اختیار کرکے دوکانداری کو باعثِ فخر بنا دیا ہے۔ لارڈ روزبری سابق وزیر اعظم انگلستان جو وہاں کے ایک معزز اور پُرانے خاندان کے رُکن علم و فن میں یکتا۔ اور فصاحت و بلاغت میں مشہور زمانہ ہیں۔ دُودھ مکھن وغیرہ کی دوکان کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وُہ دوکان ایک بڑا کارخانہ ہے۔ مگر قابلِ غور امر یہ ہے کہ انگلستان کے وزراء کو بیوپار سے عار نہیں۔ اور ہندوستان کے شہروں میں سینکڑوں بے ملک نواب ایسے ہیں۔ کہ بھُوکے مرجائینگے۔ مگر تجارت کرنے سے شرم کرینگے "مارکوئیس آف لنڈن ڈری" طبقہ امراء کی ایک ذی رُتبہ رُکن ہیں۔ جو پتھر کے کوئلے کی دوکان رکھتے ہیں اور ایک اور لارڈ صاحب ایسے ہیں کہ میوہ کی تجارت کے بیحد شائق ہیں۔ اور ان کی کئی دوکانیں میوہ کی جاری ہیں۔ جن میں سے ایک چیرنگ کراس ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہر وقت سجی رہتی ہے۔ اور مسافروں کو عُمدہ۔ تازہ اور خوشگوار میوجات بہم پہنچاتی ہے۔ اہلِ ہندوستان کو ان مثالوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

مضمون نویسی

مضمون نویسی کوئی ایسی آسان اور سہل چیز نہیں ہے۔ جیسا کہ لوگوں میں آج کل اُسکا عام مفہوم ہو رہا ہے۔ کہ آنکھ بند کی اور صفحے کے صفحے لکھ ڈالے۔ اکثر اخبارات اِس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کہ عنوان بامعنی اور معقول دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور مضمون اوّل سے آخر تک بے دیکھے بھالے چھاپ دیا۔ خواہ نامہ نگار صاحب نے عنوان کے خلاف خامہ فرسائی کر کے رطب و یابس ہی بھر دیا ہو۔ جب تک کسی شے کے متعلقہ قواعد و فرائض سے پوری واقفیت نہ ہو۔ اور نفسِ مدعا پر غور و خوض کرنے اور ترتیب کی قابلیت بہ لحاظ اصُول و قواعد حاصل نہ ہو۔ طبع آزمائی کرنا آنکھ بند کر کے رستہ چلنا ہے۔ حقائق و معارف اُسی وقت بیان کر سکتے ہیں۔ جبکہ تشریح و توضیحِ حقائق و معارف کے اصُول پر حاوی ہوں۔ مضمون نویسی بغیر مضمون نویسی کے اصُول و فرائض اور اسکی اہمیت سے واقف ہونے کے بے سُود اور بے سلیقگی ہے۔ اور محض قابلیت اور علمیت کا اظہار بغیر خوش سلیقگی اور ترتیب کے بھدّا پن ہے۔

یہ دُوسری بات ہے۔ کہ بعض ایسے اشخاص ہوں۔ جو فطرتاً خداداد قابلیت سے اصُول و قواعد کے مطابق مضمون نویس واقع ہُوئے ہوں۔ تو بھی ہر ایک شے قدرتاً منازلِ مدارج رکھتی ہے۔ اور اعلیٰ ترقی و کامیابی اور باکمال ماہرِ فن ہونے کے لئے اُنکا طے کرنا لازمی ہے۔

مضمون نویسی کے متعلق چند مختصر اصُول و قواعد نہایت کوشش و محنت سے انتخاب کر کے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وُہ کسی پہلو پر نامکمل ہوں۔ یا اُن میں کسی قسم کی فروگذاشت ہو۔ مگر وہ بحیثیت مجموعی ایک مضمون نویس کے لئے مفید اور اصُولِ مضمون نویسی کے لئے ایک حد تک قابلِ عمل ہدایتیں ہیں۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے - اِن اصُول سے عام واقفیت نہیں ہے - اور ہمارا مقصد واقفیت عامہ ہے - اور اسی لئے انہیں مخزن کے ذریعہ اہلِ وطن تک پہنچانے کی ضرورت محسوس ہُوئی -

واکر صاحب مضمون کی تعریف اِس طرح کرتے ہیں -

(۱) مضمون ایک غیر مسلسل تکمیل ہے -

(۲) مضمون ایک آزادانہ قسم کا مسودہ ہے -

"انحصارِ مضمون نویسی"

(۱) نفسِ مضمون یا مادہ بحث -

(۲) مضمون کی وضع -

(۳) طرزِ تحریر جو اجمائی حالت سے پیدا ہوتی ہے -

نئی حقیقت صرف اصلی ذخیرۂ ذہنیات کی ترقی ہی نہیں کرتی - بلکہ ہر مرتبہ ایک زینہ تیار کرتی ہے جس کے ذریعہ سے غیر منکشف اور غیر متحقق امُور تک پہنچ سکتے ہیں -

ابتدائی حالت میں عام فہم اور گرد وپیش افتادہ نفسِ مضمون منتخب کیا جائے جس میں سہُولت ہو -

جین پال ایجر کہتا ہے کہ "کسی مضمون پر کچھ نہ لکھو - جب تک پہلے خود اُسکو کافی طور پر نہ پڑھ لو - اَور کسی مضمون کو نہ پڑھو - جب تک اپنے آپ کو اُس کا بدرجہ غایت مستند نہ پاؤ"

ایک کتابِ یادداشت ضروری ہے - جس میں (۱) روزمرہ کے خاص واقعات - (۲) کتابوں کے دلچسپ وضروری پتے - تعریفات (۳) عجیب خیالات (۴) خاص طور کا فسانہ (۵) کتابوں کی نام معہ مصنف (۶) تاریخ وار حالات (۷) اہم تبدیلات درج رہیں -

اوپی ایک مشہور مصوّر کے شاگرد نے اُس سے بجمالِ اصرار پُوچھا - کہ براہ مہربانی فرمایئے - کہ آپ اپنے رنگ میں کیا ملا دیتے ہیں - اُس نے کہا - کہ

"میں اس میں دماغ کو ملا دیتا ہوں"

مضمون کی وضع یعنی

(۱) تمہید (۲) مضمون کی بطور کافی تشریح و توضیح (۳) نتیجہ۔

مضمون نویسی کے ذاتی فوائد۔

(۱) وسعت معلومات (۲) واقعات کا ترتیب دینا آتا ہے (۳) مضمون کے لکھنے سے بہت لوگوں کا جہل مرکب ٹوٹ جاتا ہے۔ جو کسی غلط علم و اطلاع پر اصرار کرتے ہیں۔

لارڈ بیکن کہتا ہے کہ "پڑھنے سے انسان معقول ہوتا ہے اور مباحثہ سے مستعد اور لکھنے سے کامل ہو جاتا ہے"۔

توضیح و تشریح میں اعتدال اور ضبط ضروری ہے۔

اوّل غور کرنے کی عادت ڈالو۔ اُن باتوں کی تلاش کرو۔ جنپر غور ہونا چاہئے۔ عُمدہ مضمون نویس ہونے کے لیئے مناسب ہے۔ کہ عالم و فاضل مصنفوں اور قابل انشا پردازوں کی تحریرات بغور مطالعہ کیا کرو۔

سسرو کہتا ہو۔ کہ "قلم فصاحت کا صانع اور معلّم ہے" اس لئے جہاں تک ممکن ہو جتنا ٹھ کے ساتھ لکھنا چاہئے۔ کیونکہ جس طرح زمین کو جتنا گہرا کھودا جاوے۔ اُسی قدر بیج کی عُمدہ پرورش ہوتی ہے۔ اور زیادہ بار آور ہوتا ہے۔ اُسی طرح تحریر میں جس قدر غور سے کام لو مطالب و معانی کے پھل پھول دامن تلاش کو گوہر مقصود سے بھرتے ہیں۔

اگر تم زبان سیکھنا چاہتے ہو۔ تو اوروں کو سکھلاؤ۔ اور اگر تم عُمدہ منشی ہوا چاہتے ہو تو مضمون لکھو۔

اقسام مضامین

(۱) مضامین متعلق اخلاق۔ مثلاً راستبازی۔ دیانتداری۔ فیاضی اور دُوسرے اوصاف حمیدہ۔

(۲) علم قوا، باطنی - مثلاً تمیز - خواہش - حافظہ و دیگر قوا عقلی و دماغی -
(۳) معاملاتِ ملکی - جیسے قومی دولت - آزاد تجارت - مالگذاری - حکام - اور دوسری بحثیں متعلق حکومت اعلیٰ

طرزِ تحریر وہ طریقہ ہے جس میں واقعات کی ترتیب بیان کی جاتی ہے یا جس میں مسلسل خیالات ظاہر کئے جاتے ہیں - یہ صحیح و موزون الفاظ کے جمع کرنے اور اُن کو جملوں، فصلوں اور ابواب میں ترتیب دینے کا ہنر ہے -

عمدہ طرزِ تحریر کی علامتیں -

(۱) عمدہ و منتخب بامو قع الفاظ (۲) ترتیبِ الفاظ (۳) مناسب رنگینی -

پلینی نے اپنے ایک دوست کو لکھا - کہ

"مجھے مختصر لکھنے کی فرصت نہ تھی - اِس لئے میں نے آپ کو یہ طول طویل خط لکھا"

بٹلر اختصار کی تعریف میں یوں مبالغہ کرتا ہے :-

"اختصار بہت خوب ہے - چاہے ہماری بات کوئی سمجھے یا نہ سمجھے" -

شیخ ضیاء الحق از ہاپوڑ - ضلع میرٹھ

خدنگِ نظر - آصفی پریس لکھنؤ میں منشی نوبت رائے صاحب نظر کی عنایت سے ہر مہینے ایک رسالہ اردو زبان میں شائع ہوتا ہے جسکے سرورق کی چمک خوبی پسند دلوں میں فی الحقیقت خدنگ بنکر بیٹھتی ہے - سرورق الٹیں تو دلچسپ مضامین نثر ملتے ہیں - سولہ صفحے نثر کے پڑھ چکیں تو طرحی اور غیر طرحی غزلوں کا ایک خاصہ گلدستہ ہے - اِنکے بعد سولہ صفحہ ناول کی بھی موجود ہیں - جو کسی انگریزی فسانہ کا ترجمہ ہے - انتظام میں نئی بات یہ ہے کہ آپ چاہیں تو صرف مضامین خریدیں - چاہیں صرف گلدستہ نظم لیں اور جی چاہے تو ناول کے خریدار بنیں - تینوں جزو کی قیمت تین روپیہ - دو جزو کی عا دو روپیہ اور کسی ایک جزو کی سوا روپیہ ہے +

حقوقِ رعایا

ذیل میں لارڈ میکالے کی ایک مشہور تقریر کا جو انہوں نے ۱۰- جولائی ۱۸۳۳ء کو پارلیمنٹ میں کی تھی- ترجمہ درج ہے اسوقت ایک مسودہ قانون اِس مضمون کا پیش ہوا تھا کہ ہندوستانی مقبوضات پر زیادہ مہذب طریقہ سے حکومت کی جائے- یہ ترجمہ ہمارے دوست مولوی عبدالرشید صاحب چشتی بی- اے نے کیا ہے- جنہیں انگریزی اور اردو علمِ ادب دونو سے خاص دلچسپی ہے :-

صاحبان! میں آپ کا بہت سا وقت لے چکا ہوں مگر اِس مسودہ میں ایک جملہ ایسا ہے کہ مجھے بے اختیار مجبور کرتا ہے کہ اُسپر میں چند الفاظ کہوں- میری مراد اُس نیکی اور ہمدردی سے بھرے ہوئے اور مدبرانہ فقرے سے ہے جو یہ قرار دیتا ہے کہ ہماری ہندوستانی رعایا میں کوئی شخص اپنی رنگت- نسل- یا مذہب کی وجہ سے کسی عہدے کے حاصل کرنے کے ناقابل نہیں سمجھا جائیگا- مجھے ڈر ہے کہ میرے لئے بھی فلسفی کا لقب تجویز نہ کیا جائے جو تنگدل اور خودغرض لوگ ایک نہایت مذموم اور حقارت آمیز مفہوم میں استعمال کیا کرتے ہیں- مگر میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ مجھے اپنی زندگی کے اخیر دن تک اِس بات کا فخر ہوگا کہ میں نے اِس مسودہ کے بنانے میں جس میں یہ فقرہ موجود ہے مدد دی ہے- ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ وقت کبھی نہیں آسکتا جب ہندوستانی اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں پر مقرر کئے جاسکینگے- کہا جاتا ہے کہ یہی شرط ہے جس پہ ہماری طاقت کا انحصار ہے- ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہمیں اپنی رعایا کو اُن تمام نعمتوں سے بہرہ ور نہ کرنا چاہیئے- جن سے مستفید ہونے کی اُن میں قابلیت ہے- نہیں- جنکا دینا ہماری طاقت میں ہے- بلکہ جن کے دینے سے ہماری حکومت کے استحکام اور استمرار میں فرق آئیگا کوئی اندیشہ نہیں- میں اِس خیال کی بڑے زور سے تردید کرتا ہوں اور اِسے سچی حکمتِ عملی

اور سچی انسانیت دونوں کے برخلاف سمجھتا ہوں۔

مَیں ہرگز ہرگز ایسے نازک مسئلہ میں جلدی سے کام نہیں لینا چاہتا۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی بھلائی اِسی میں ہے کہ دیسیوں کو بڑے بڑے عہدے بتدریج اور آہستہ آہستہ دیئے جائیں۔ مگر اس بات کا خیال آنے سے کہ جب وہ وقت آجائے کہ ہندوستان کی بہتری کے لئے یہ تبدیلی ضروری ہو تو اسوقت ہم اپنی طاقت کو معرضِ خطر میں ڈالنے کے اندیشہ سے ایسی تبدیلی کرنے سے اِنکار کریں۔ مجھے بے اختیار رنج اور غصہ آتا ہے موجودہ صورت میں یہ پالیسی نہ صرف قابلِ نفرت ہے بلکہ بیہودہ ہے۔ صرف سلطنت کی وسعت سے کوئی فائدہ لازم نہیں آتا۔ یہی وسعت بہتیری سلطنتوں کے لئے ناقابل برداشت بوجھ۔ اور بعضوں کے لئے مہلک ثابت ہوئی ہے۔ زمانہ موجودہ کا ہر ایک مدبر اِتنا تو ضرور کہے گا کہ کسی قوم کی خوشحالی اسکے افراد کی خوشحالی پر موقوف ہے۔ اور ایسی سلطنت کی خواہش کرنا جس سے نہ کسی شخص کے آرام میں ازدیاد ہو نہ امن میں محض بچوں کی سی ہوسِ خام ہے۔

ہماری قوم تجارت میں ایسی بلند پایہ ہے اور صنعت و حرفت میں ایسی ممتاز ہے کہ اگر کوئی دوسری قوم حصولِ علم میں۔ آسایش زندگی کے مذاق میں اور حصولِ دولت میں ترقی کرے تو اس سے ہمارا سراسر فائدہ ہے۔ اُن بیشمار فوائد کا اندازہ کرنا جو مشرق کی کثیر آبادی میں مغربی تہذیب کے پھیلنے سے حاصل ہو سکتے ہیں ناممکن ہے۔ اِس مسئلہ کو اگر ہم نہایت خود غرضی کی نظر سے بھی دیکھیں تو بھی ہمارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ ہم ہندوستان کے لوگوں کو مہذب حکومت اور آزادی دیں۔ بجائے اِس کے کہ حکومت خراب ہو اور وُہ ہمارے مطیع و زیرِ عنان رہیں۔ اگر اُنکے اپنے بادشاہ اُنپر حکمران رہیں مگر وُہ ہماری بنائے ہوئے کپڑے پہنیں اور ہمارے اوزار استعمال کریں تو یہ اس سے بہتر ہوگا کہ انگریز کلکٹروں اور انگریز مجسٹریٹوں کے سامنے جُھک جُھک کر کورنشات و آداب بجالائیں مگر جاہل ایسے ہوں

کہ ہماری ساخت کی قدر نہ کر سکیں یا مفلسی کے مارے خرید نہ سکیں۔ مہذب لوگوں کے ساتھ تجارت کرنا وحشیوں پر حکومت کرنے سے بدرجہا مفید ہے۔

برنیر صاحب لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض شقی القلب لوگوں کا دستور تھا کہ جب وُہ رعایا میں سے کسی شخص کو لائق یا جوشیلا دیکھتے اور اس کے قتل کرنے کی جُرأت بھی اپنے آپ میں نہ پاتے تو اُسے ہر روز افیم کی معجون دینا شروع کر دیتے اور چند مہینوں میں اُسکے تمام جسمانی اور دماغی قویٰ کو نکما اور سُست کر کے اُسے مخبوط الحواس اور مجنوں بنا دیتے۔ یہ ناپاک حرکت جو قتل سے بھی بڑھ کر خوفناک ہے اُن ہی کے شایان تھی جو اسکے مرتکب ہوتے تھے۔ انگریزوں کے لئے یہ کوئی نمونہ نہیں ہو سکتی۔ ہم کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ایک اتنی بڑی قوم کو افیم دیجائے اور جس عظیم گروہ انسانی کو خُدا نے ہمارے سپُرد کیا ہے اُسکو اس ظالمانہ غرض سے نکما اور بے حِس کر دیں کہ وُہ ہماری تابع فرمان ہو جائے۔

اُس اختیار کی کیا توقیر ہو سکتی ہے جو بدی۔ جہالت۔ اور فلاکت پر مبنی ہو؟ حیف ہے اگر ہم اختیار کو اُن پاک فرائض کو توڑ کر قائم رکھ سکیں جو حکام پر واجب ہیں۔ خُدا نے ہم کو مُلکی آزادی اور دِماغی روشنی کا غیر معمولی حصّہ دیا ہے۔ اور ہندوستانیوں کو جو تین ہزار سال تک خود مختار حکومتوں کے ماتحت اور مذہبی پیشواؤں کی قید میں رہ کر پست و ذلیل ہو گئے ہیں۔ ہم پر حق حاصل ہے۔ ہماری تہذیب اور ہماری آزادی کسی کام کی نہیں ہے اگر ہم نسلِ انسان کے کسی حصّہ کو اُس آزادی اور تہذیب کا پُورا پیمانہ دینے کو تیار نہ ہوں۔

پھر میں پُوچھتا ہوں کہ کیا ہم ہندوستانیوں کو اس لئے جاہل رکھیں کہ وُہ ہمارے زیر رہیں؟ یا یہ ممکن ہے کہ وُہ علم بھی حاصل کر لیں اور اِن میں ترقی کی خواہش پیدا نہ ہو؟ یا ہم چاہتے ہیں کہ اُن میں ترقی کی خواہش پیدا کر کے اُس کے جائز اظہار کے لئے کوئی سامان مہیا نہ کریں۔ کون ہے جو اِن سوالوں کے جواب میں "ہاں" کہہ سکے؟ مَیں جو کچھ کہتا ہوں بلا خوفِ تردید کہہ رہا ہوں۔ ہمارا فرض اِس بارہ میں ظاہر ہے۔ ہمارا راستہ صاف نظر آ رہا ہے

اور بیشک یہی دانائی قومی بہبودی اور قومی افتخار کا راستہ ہے۔

ہماری ہندوستان کی سلطنت کی قسمت میں سوائے سخت تاریکی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بھلا اس سلطنت کے نصیب پر قیاس بھی کیا لگایا جا سکتا ہے۔ جس کی دُنیا کی تواریخ میں کوئی مثال ہی موجود نہیں۔

ہندوستان کے لئے تو علم تمدّن میں ابھی ایک نیا باب کھلا ہے۔ جو قوانین اِس کے مدّ و جزر سے مربوط ہیں وُہ ابھی ہمیں معلوم ہی نہیں ہوئے۔ ممکن ہے کہ ہمارے طریقِ عمل سے عوام کے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہو یہانتک کہ ہماری پابندی کی انہیں ضرورت ہی نہ رہے یعنی اعلیٰ طرزِ حکومت سے ہم اپنی رعایا کی ایسی تربیت کریں کہ ان میں خود ہم سے بہتر حکومت کرنے کا مادہ پیدا ہو جائے اور مغربی تعلیم سے مستفیض ہو کر وُہ کسی آیندہ زمانہ میں مغربی قوانین و رسم و رواج کی بھی خواہش کرنے لگیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وُہ دن آنیوالا ہی یا نہیں۔ مگر خدا نہ کرے کہ میں اُس دن کو روکنے یا دُور رکھنے میں ساعی ہوں۔ جب کبھی وُہ دِن آئے وہ انگریزی تاریخ میں سب سے زیادہ قابلِ فخر دِن ہوگا

ایک بہت بڑی قوم کو غلامی اور اوہام باطل کے گہرے گڑھے میں ڈوبا ہوا پانا اور پھر اُنپر ایسی حکومت کرنا کہ وُہ تمدّن کے تمام حقوق کی خواہش کرنے کے قابل ہو جائیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے کہ اسپر جسقدر ناز کیا جائے تھوڑا ہے۔ تاجِ سلطنت چھن جائے تو چھن جائے۔ غیر متوقعہ صدمات ہماری بڑی بڑی تجویزوں کو خاک میں ملا دیں۔ تو ملا دیں۔ میدانِ جنگ میں ہمیں شکستیں ہوا کریں۔ مگر جو فتوحات میرے مدّنظر ہیں۔ وہ شکست سے مبرا ہیں۔ جس سلطنت کی میں خواہش کرتا ہوں وُہ اسباب انحطاط سے آزاد ہے۔ یہ وہ فتوحات ہیں جو عقلِ سلیم خاموشی سے جہالت اور وحشت پر حاصل کرتی ہے۔ اور یہ ہمیشہ زندہ رہنے والی سلطنت۔ ہماری فنون۔ ہماری اخلاق۔ ہمارے علم ادب اور ہمارے قوانین کی سلطنت ہے +

عبدالرشید چشتی

مرزا غالب

فکر انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا ۔۔۔ ہے پرِ مرغِ تصور کی رسائی تا کجا
روح تھا تو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا ۔۔۔ زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
صُورتِ رُوحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

عجزِ کلکِ تصور ہے کہ یا دیواں ہے یہ ۔۔۔ یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسے کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ ۔۔۔ نُورِ معنی سے دلِ افروزِ سخنداں ہے یہ
نقشِ فریادی ہے تیری شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر ۔۔۔ محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرداز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر ۔۔۔ خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ تو اُجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[۱] میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ۔۔۔ ہو تصوّر کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں! ۔۔۔ آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!
گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ جوئندۂ دلسوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ۔۔۔ ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

(۱) ملک جرمن میں ایک مقام ہے جہاں گوئٹے شاعر مدفون ہے ۱۲

تیرے ہر ذرہ میں خوابیدہ ہیں سو شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اقبال

کوئی نہیں

از منشی نادر علیخان صاحب نادر۔ کاکوروی

کل تک سب تھے تیرے لیکن آج ہی تیرا کوئی نہیں
آہ اے قوم ترا اب حامی اپنا پرایا کوئی نہیں

ہونے کو یاں اب بھی ہیں لاکھوں قاضی مفتی صوفی ملا
لیکن تیرے کام کچھ آئیں اُن میں اِتنا کوئی نہیں

تیرے سخنور تیرے شاعر تیرے ادیب اور تیرے منشی
نام ہی اُن کے رہ گئے باقی اب نظر آتا کوئی نہیں

کل تو وہ تھی جس کی صدا پر سارا جہاں تھا کان لگائے
آج وہی تو ہے بیکس جس کی سُنتا کوئی نہیں

تیرے عیش کے دن تھے جب تک ہنسنے والے جمع بہت تھے
تجھ پر غم کا وقت پڑا تو رونے والا کوئی نہیں

ہم نے مانا تجھ سے پہلے اور بھی تھیں کچھ قومیں رسوا
لیکن تیری طرح جہاں میں اب تو رسوا کوئی نہیں

ملنے سے عالم ملتا ہے تو خود سب کا ہو کر

تو ہی کعبہ کا جب نہیں اے دل — تو یاں تیرا کوئی نہیں
عاجز سب کی عقل رسا ہے — جس نے کہا ہے خوب کہا ہے
دُنیا ہے اک اندھی نگری — اس میں بینا کوئی نہیں
ٹھمری ٹپّا اور غزل پر — اہلِ محفل کان دئیے ہیں
نادر اس فریاد سے حاصل
جس کو سُنتا کوئی نہیں

دِماغ

کیوں نہ ہو عالی دماغی سے محقق تر دماغ — جو قویٰ حق نے دئیے اُن میں ہوا قوی تر دماغ
کیوں نہ اعضائے رئیسہ کو مباہات اسپہ ہو — سارے اعضائے بدن ماتحت ہیں افسر دماغ
استخوان و مغز۔ اور اسکے سوا کچھ بھی نہیں — پر اسی مغز استخواں میں ہے عجب جوہر دماغ
صاحبِ تمیز خیر و شر اسی سے ہے بشر — جوہر اوصافِ انسانی ہے سر تا سر دماغ
بزم آرا ہے اگر نقش و نگارِ صنع کا — اختراع و حکمت و ایجاد کا ہے گھر دماغ
شاہد ناطق ہے نیرنگِ طلسم رزم و بزم — معجزہ جس کا ہے افسوں وُہ ہے افسوں گر دماغ
ہے اسی سے دانش و فرہنگ کو نشو و نما — بندہ پرور۔ ہے خرد پرور ہُنر پرور دماغ
دیدنی ہے صورتِ شہبازِ پروازِ خیال — جب لگاتا ہے پئے صید سخن چکر دماغ
ہاتھ میں جب سے حواسِ خمسہ کی باگ اسنے لی — وُہ طرارے ہیں کہ جن سے آپ ہی ششدر دماغ
عالمِ معنے میں ہے دھاک اس کے زورِ فکر کی — جو مہم پیش آئی کر دیتا ہے اس کو سر دماغ
سرخوشانِ بادۂ تحقیق سے پُوچھے کوئی — بادۂ شیراز سے بڑھ کر ہے کیف آور دماغ

ستیاں پا لغزا سکی ہیں خدا را فلسفی　　دیکھنا سر کی نہ دے تجھ کو کہیں ٹھوکر دماغ
گرچہ وابستہ اسی سے ہے دماغی روشنی　　نورِ چشمِ دانش و بینش نہیں ہے ہر دماغ
پھول برساتا ہے امن و عیش کے گاہے کہیں　　گاہ کھچواتا ہے نقضِ امن پر خنجر دماغ
دونوں شانیں آشکارا و نہاں صاف اسکی ہیں　　گل سرِ دستار۔ یا در آستیں اژدر دماغ
لاکھ میں دو چار ہونگے اہلِ علم و اہلِ فضل　　مدعیِ فضل ہیں لیکن ہزاروں خر دماغ

خر دماغی اک طرف آزاد سخت افسوس ہے
چھوڑے بیٹھے ہیں معطل نوجواں اکثر دماغ

آزاد۔ عظیم آبادی

الفتِ مادری

ملک الشعراء ٹینیسن کی ایک مختصر سی نظم کا ترجمہ ہمارے غائبانہ عنایت فرما جناب محی الدین صاحب صدیقی نجیب آبادی لکھنؤ سے ناظرین مخزن کیلئے ارسال فرماتے ہیں۔ قصہ جسکی طرف ان اشعار میں اشارہ ہے۔ یہ ہے کہ ایک بہادر کی لاش کو جب لوگ میدانِ جنگ سے گھر میں لائے تو ایک کہرام مچ گیا۔ ہر کہ و مہ روتا تھا۔ مگر اُس کی پیاری بیوی پر اس سانحہ کا کچھ ایسا اثر ہُوا۔ کہ وُہ شل سی رہ گئی۔ اور اُس کے آنسو خشک ہو گئے۔ بہتیرے جتن کئے مگر اشک نہ بہے۔ آخر اُسکے بچہ کو لا کر باپ کی لاش کے پاس بٹھایا گیا۔ اُلفتِ مادری جوش میں آگئی۔ اور بے اختیار آنسو نکل پڑے:۔

جب لائے گھر میں لاشہ اُس مرد صف شکن کا　　نکلی نہ آہ۔ بگڑا نقشہ نہ گلبدن کا
کہنے لگی خواصیں یوں اُس سے ہمزبان ہو　　"یا ہاتھ جاں سے دھوئے یا مائلِ فغاں ہو"
مل جل کے اُن سبھوں نے مرحوم کو سراہا　　"کیا خوب آدمی تھا! واللہ کیا جواں تھا"
"تھا دوستی میں پکا اور دشمنی میں پورا"　　اسپر بھی سیمتن کو جنبش ہوئی نہ اصلا

پھر ایک پیش خدمت اپنی جگہ سے اُٹھ کر آئی دبے قدم سے۔ لاشہ تھا جس جگہ پر
منہ پر جو نوجواں کے چادر تھی۔ کی علیحدہ بیوی کی آنکھ سے پر نکلا نہ پھر بھی قطرہ
آخر اِک آئی اُٹھ کر نوے برس کی بڑھیا زانو پہ اُس نے اُسکے بچہ کو لا بٹھایا
بہ نکلے آنسو فوراً۔ مظلومیوں پکاری
"میرے یتیم بچے۔ اماں ہو تم پہ واری"

برسات

گھٹائیں کالی کالی چھا رہی ہیں! ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی آ رہی ہیں!
مٹا دیں کلفتیں سب ایک دم نے بدن میں کیسی جانیں آ رہی ہیں!
تمنا ہے "گھٹاؤ" تم سے لپٹوں کہ جی میں شوخیاں کچھ آ رہی ہیں!
وُہ رُکنا پھر وہ رپ رپ تیرا چلنا ادائیں تیری بدلی بھا رہی ہیں!
اِدھر آ پیار کر لوں تجھ کو بدلی! یہ پروازیں مزا دکھلا رہی ہیں!
ذرا کم مُکرا او شوخ بدلی! کھڑی زہرہ بہت شرما رہی ہیں!
نہو بیچین اتنا قلب مضطر وُہ بوندیں ننھی ننھی آ رہی ہیں!

مزا آنکھیں عجب دکھلا رہی ہیں! وُہ چھم چھم کرتی بوندیں آ رہی ہیں!
نکھار اِن پر غضب ہی کچھ سوا ہے! کہ پریاں باغ کی اٹھلا رہی ہیں!
یہ انفاسِ حسینانِ چمن ہیں! جو بوئیں بھینی بھینی آ رہی ہیں!
بڑی ان سبزہ رنگوں کے ہے خاطر کہ بوندیں موتی بن بن آ رہی ہیں!
زمیں کو خادمائیں کیا ملی ہیں! جو فرشِ مخملیں پھیلا رہی ہیں!

تعالی اللہ کیا ساقی ہیں بوندیں
شراب عیش بھر بھر لا رہی ہیں
یہ بی فطرت بھی ہیں کتنی قیامت
سمے کیا کیا مجھے دکھلا رہی ہیں

نذیر حسین

دارِ فنا

بگذر ز کبر و ناز کہ بہ جبر یہ روزگار
جیبِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

ہزاروں عجائب ہیں پیشِ نظر
تماشا گہِ دیدۂ دیدہ ور
مگر ان میں ایسی نہیں کوئی شے
بچے دستبردِ فنا سے جو ہے
نہنگِ اجل منہ ہے کھولے ہوئے
ہے موت اپنی تلوار تولے ہوئے
ابھی پُر ثمر تھے درخت و شجر
ابھی کٹ گئے ہو کے وقفِ تبر
نہیں کوئی گردن کش و نامور
جسے موت کے ہات سے ہو مفر
ہزاروں پری پیکرانِ حسیں
ہوئے قبر میں جا کے عزلت گزیں
کئی گلبدن خاک میں جا ملے
شکارِ نہنگِ اجل ہو گئے
نہ وامق نہ عذرا جہاں میں رہے
ایاز اور محمود بھی چل بسے
نہ یوسف کا وہ حسنِ رنگیں رہا
نہ عشقِ زلیخائے غمگیں رہا
نہ آں بلبل و نغمۂ دل کشش
نہ گل ماند و نے رنگ و بوئے خوش
تھے لاکھوں امیرانِ ہودج نشیں
جہاں میں نشاں جنکا باقی نہیں
کہاں قصرِ کسرے کہاں مُلکِ جم
کہاں قیصر اور اُس کا جاہ و حشم
کہاں ہے سکندر ہے دارا کہاں
وہ تختِ رواں اور سلیماں کہاں

گئے ہیں ہمایوں و اکبر کدھر — جہانگیر و شاہِ جہاں نامور
سبھا بیر و بکرم کی برہم ہوئی — اشوکھا کی شوکت بھی جاتی رہی
وہ وکٹوریا صاحبِ تخت و تاج — تھے زیرِ نگیں سینکڑوں جسکے راج
بایں شوکت و شان و فرِ مہی — بدیں عظمت و فخرِ شاہنشہی
وہ یوں دم میں دارِ فنا سے اٹھی — کہ شستہ انگ عالم میں ہل چل مچی
یہ دنیا کہ ہے دلکش و دلربا — حقیقت میں ہے ایک فانی سرا
محبت نہ اس بے وفا سے کرو — مکائد سے اس کے ہمیشہ ڈرو

سیّد فرزند علی شاہ شریف

بے صبری کا علاج

جس شخص کو بے صبری کا عارضہ ہو اسکو چاہیئے کہ غریبوں کے گھر میں جائے اور اُنکے تنگ مکان۔ خراب چارپائیوں۔ ٹوٹے ہوئے جوتوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو دیکھے۔ یہ بھی دیکھے کہ وہ کیا کھاتے ہیں اور پیتے ہیں۔ اُن سے اُنکی آمدنی پوچھے اور اپنی آمدنی کا مقابلہ کرے۔ جب وہ واپس آئیگا تو یقین ہے کہ عارضہ بے صبری کا جاتا رہیگا +

(جرمن اخبار)

(س۔ش۔م۔نذیری ہاشمی)

حرص کا علاج

جس شخص کو حرص کی بیماری ہو اُسکو چاہیئے کہ کسی مقبرہ میں چلا جائے اور مزار کی لوحیں پڑھے اُنسے معلوم ہوگا کہ کُل دنیا کی کوششوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ کبھی اُسکا مکان بھی وہاں ہوگا۔ اور تھوڑی سی مٹی اسکی چادر کا کام دیگی۔ اور تھوڑی سی مٹی اس کا تکیہ بنے گی +

(س۔ش۔م۔نذیری ہاشمی) (جرمن اخبار)

پچکول

پوشاکِ غیر کے نہیں ممنون ہم فقیر — پیوند ہی سہی مگر اپنی ردا تو ہے
فرقت میں ہو نصیب ہمیں داغ یا کہ درد — دل سے نہ کیوں لگائیں تمہاری عطا تو ہے
اے رہروانِ کوئے صنم دیکھ کر چلو — اچھا ہمارا دل نہ سہی کچھ پڑا تو ہے
مفلس کے پاس جائے کس اُمید پر گدا — منعم سے چاہے کچھ نہ ملے آسرا تو ہے
ہنستے اُٹھے وہ کج فصاحت کے پاس سے — دل ہو جگر ہو کوئی نہ کوئی لیا تو ہے

(حامد علی خاں - بیرسٹر ایٹ لا) (سید عباس حسین فصاحت لکھنوی)

حشر کے دن بھی میں دیوانہ غضب بے باک تھا — ایک ہی جھٹکے میں دامانِ قیامت چاک تھا

کچھ کم پڑا تھا طول میں آخر بڑھا لیا — محشر نے مجھ سے مانگ کے دن انتظار کا

اب ضعف نے یہ ہجر میں حالت تباہ کی — بیٹھے تو دل کو تھامے کے اُٹھے تو آہ کی

دکھا دینگے کہ یوں مرتے ہیں تم پر — ہماری زندگی نے گر وفا کی

(حامد علی خاں) (فدا علی عیش لکھنوی تلمیذ میر کلو عرش)

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ — ہر دل پہ چھا رہا ہے رُعبِ جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی دُگدا میں ہے طبیعی — جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکلے کوئی — پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی — آنکھوں میں بس رہا ہے جنکے جلال تیرا
ہے پاس دوستوں کے تیرے یہی نشانی — یارب کبھی نہ پائے زخمِ اندمال تیرا

(میر نذیر حسین) (حالی)

...ب تلک ہست تھے دشوار تھا پانا تیرا
مٹ گئے ہم تو ملا ہم کو ٹھکانا تیرا

...ہت تیرے لئے ہر نہ کوئی جسم ہے تو
چشم ظاہر کو ہے مشکل نظر آنا تیرا

...س جہت چھان چکے ہم تو کھلا ہم پہ یہ حال
رگ گردن سے ہے نزدیک ٹھکانا تیرا

(میر نذیر حسین) (امیر لکھنوی)

...ڈی سانسیں جو میں بھرتا ہوں تو وہ کہتے ہیں
بے اثر آہ و فغاں سے تیرے ہوتا کیا ہے

...ن اسکی ہے دل اسکا ہی جگر اس کا ہے
ہم بھی اس کے ہیں خدا جانے ہمارا کیا ہے

(لالہ سری رام) (مرزا شرف یار خاں صاحب رئیس جاورہ)

بتوں کی محبت میں دنیا گئی
ارے کیسی دنیا کہ عقبےٰ گئی

خدا کی جدائی تو سہہ لی شرف
بتوں کی جدائی مگر کھا گئی

(ـ" ـ) (ـ" ـ)

...ار میں خموش وہ ناحق عتاب میں
طاقت تھی جتنی صرف ہوئی اضطراب میں

...م گناہ نہ ہم عقوبت یہ رنج ہے
ہے سے اٹھائی اس نے اذیت عتاب میں

(ـ" ـ) (نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ دہلوی رئیس جہانگیر آباد)

...ں میں رہ نہ جائے نام الفت تا کہیں باقی
نشاں ہائے مزار عاشقاں مٹوائے جاتے ہیں

(ـ" ـ) (نواب صفدر علی خاں ـ صفدر ـ مرحوم رئیس رام پور)

...ے موسم بہار تو اتنا قیام کر
حسرت نکال لے کوئی دیوانہ چند روز

(ـ" ـ) (ـ" ـ)

...ہیں میکدے میں کلیسا میں دیر میں
دیکھا تو تھے چراغ ہر اک انجمن میں تم

(ـ" ـ) (ـ" ـ)

...ت آشنا ہیں زمانے میں لیکن
کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں

(ـ" ـ) (ـ" ـ)

...ق زار میں نہیں تم پہ نثار میں نہیں
مجھکو ہے انفعال یوں میں نے ستم اٹھائے کیوں

(خواجہ محمود حسن) (آنریبل سید محمود)

...ماں ہوں یوسف انہیں کہہ کے ناحق
وہ کہتے ہیں کیا ہم غلامی کرینگے

(ـ" ـ) (سیف الحق ادیب دہلوی)

...ں کی علامت پیری ہوئی عیاں
ہم منتظر ہی رہ گئے عہد شباب کے

(ـ" ـ)

...ھر پھیرتا ہوں نظر تو ہی تو ہے
ادھر تو ہی تو ہے ادھر تو ہی تو ہے

...خانہ بے تکلف
میری جان پردہ نہ کر تو ہی تو ہے

...م میں شمع کی رات انگلی
یہاں اور وہاں جلوہ گر تو ہی تو ہے

(جہانگیر) (میر بیان یزدانی مرحوم)

ہمی پست سے پست بالا سے بالا زمیں بھی ہمی ہمی آسماں بھی ہمی ہیں
کوئی دیر میں جائے کوئی حرم کو یہاں بھی ہمی ہیں وہاں بھی ہمی ہیں
غرض جو ہے عالم میں پیدا و پنہاں وُہ پیدا بھی ہم وہ نہاں بھی ہمی ہیں
ہوا ما بدولت پہ روشن یہ آخر جہانگیر نُورِ جہاں بھی ہمی ہیں

آنکھوں میں کس طرح سے ہماری سمائے نیند کاجل لگا ہوا ہے شبِ انتظار کا
ملتا ہے شاہ بھی تو ملاتا نہیں نگاہ ایسا مزاج ہے ترے خدمتگذار کا
دونو جہان پھونکدیئے ایک آہ سے یہ اختیار ہے ترے بے اختیار کا

(پنڈت شیوراج ناتھ۔ عاشق)

جس بزم میں کہ وُہ نظر آتے نہیں مجھے وُہ بزم مجھ کو مجلسِ ماتم سے کم نہیں
بے تیرے فرشِ گل مری نظروں میں خار ہو بزم نشاط حلقۂ ماتم سے کم نہیں
کچھ بڑھ گیا کہ گھٹ گیا دردِ دل وجگر اے بیخودی ہمیں خبرِ بیش وکم نہیں
صدمہ الگ ہے رشک کا رنجِ فراق الگ دو داغ ایک سینے میں وُہ بھی بہم نہیں

(شیخ فتح محمد) (نامعلوم)

ہمارے دم نکلنے میں بھی اک عالم نکلتا ہو کہ وُہ مشتاق ہیں دیکھیں تو کیونکر دم نکلتا ہو
جو آئے نامہ بر رشکِ عدو کا ذکر کردینا یہ کینہ صاحبِ غیرت کے دل سے کم نکلتا ہو
کمی کیا ہوگئی ہے چاہنے والوں کی اے قاتل کہ اب تلوار کم کھنچتی ہے خنجر کم نکلتا ہو

(داغ) (فریدالدین احمد نعمانی ردولوی)

کمر لچکتی ہے خنجر سنبھل نہیں سکتا اور آپ آئے ہیں عاشق کے امتحاں کیلئے

جب سے بلبل تونے دو تنکے لئے ٹوٹتی ہیں بجلیاں اِن کے لئے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگار سادگی گہنا ہے اِس سن کے لئے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہے ایک کم سن کے لئے
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر آئے تھے دُنیا میں اِس دن کے لئے

(امیر مینائی)

اشتہارات

مخزن

لاہور سے ہر انگریزی مہینہ کے وسط میں شائع ہوتا ہے۔
قیمت عمدہ دبیز ولائتی کاغذ پر بلا محصول ڈاک عہ

دوم درجہ دیسی کاغذ پر ۔۔ عہ

محصولڈاک دونو صورتوں میں ۳ر

(مقامی خریداروں کو محصولڈاک معاف)

پہلا نمبر شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ مگر درخواستیں اس کے لئے برابر آ رہی ہیں۔ اب اپریل کا نمبر دوبارہ طبع کیا گیا ہے تاکہ سب صاحبان کے پاس مکمل جلدیں رہ سکیں۔ درخواست خریداری کے ساتھ قیمت پیشگی یا اجازت ویلیو پی ایبل آنی چاہئے۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے ۴ر آنہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔

شیخ عبد القادر مالک و ایڈیٹر۔

آبزرور ۔ (لاہور)

۲۱۔ جون سنہ ۱۹۰۱ء سے اخبار پنجاب آبزرور کے نام کو مختصر کر دیا گیا ہے اور اب صرف آبزرور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی تاریخ سے اسکے مضامین بڑھا دئے گئے ہیں۔ ایک حصہ یورپین نامہ نگاروں کے قلم سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ نئے ٹائپ استعمال ہونے لگے ہیں۔ جس سے اخبار کی چھپائی صاف اور خوشنما ہو گئی ہے۔

شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کے حکام کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانیکا یہی ایک ذریعہ ہے۔ ہفتہ میں دوبار شائع ہوتا ہے بہت سے اعلیٰ یورپین افسر اس کے خریداروں میں ہیں۔ اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوں یقیناً حکام کی نظر سے گذرتی ہیں۔

قیمت سالانہ پیشگی عہ غلام رسول بی۔ اے منیجر

کائستھ سماچار:- یہ ماہوار میگزین انگریزی میں الہ آباد کو بزیر ایڈیٹری مسٹر ایس سنہا بیرسٹر ایٹ لا [illegible] شائع ہوتا ہے۔ ملک بھر کے اخبارات نے متفقہ طور پر تسلیم کیا ہے کہ اسمیں بیشتر [illegible] مضامین ہوتے ہیں جو عام پسند ہوں اور ہر قوم کے لائق مضمون نگار اپنے انگریزی مضمونوں سے اس رسالہ کو رونق دیتے ہیں۔ اسپر خوبی یہ کہ قیمت نہایت ارزاں ہے۔ مگر پیشگی ۵ منیجر کائستھ سماچار۔ الہ آباد

ہم اور ہمارے ہم عصر

رسالہ معارف (پانی پت) ایک مفصل ریویو کے اخیر میں مندرجۂ ذیل رائے لکھتا ہے:۔ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ کیا بلحاظ چھپائی اور کاغذ کی صفائی کے اور کیا بلحاظ مضامین نہایت عمدگی اور سلیقہ اور خوبی سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور ہم کو لائق اور روشن ضمیر ایڈیٹر سے اُمید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس رسالے کے ہر حصہ اور ہر حیثیت کو ترقی دینگے اور اسکو دلچسپ تر بنانے کی کوشش میں کامیاب ہونگے۔ ہم اپنے دوست کو دل سے مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنہوں نے اُردو زبان میں ایک ایسے عمدہ اور پاکیزہ اور مفید اور دلچسپ رسالہ کے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ جو بہت ہونہار ہے اور جس سے ہماری زبان کو مغربی انشاء پردازی کے خزانہ سے مدد ملنے کی بہت بڑی توقع ہے +

رسالہ جلوۂ محبوب (حیدرآباد دکن) یہ رسالہ من جمیع الوجوہ باعتبار اُردو لٹریچر کے آپ اپنا نظیر ہے۔ نثر کا حصہ دلکش ہے تو نظم کا حصہ بھی دلچسپ ہے۔ کاغذ بھی اچھا ہے۔ چھپائی وغیرہ کا انتظام درست ہے۔ بلحاظ اس درستگی و صفائی اور دلچسپی کے قیمت بہت ہی کم ہے +

بھارت پرتاب (جھجر) جو سناتن دھرم کا ماہواری باتصویر اُردو رسالہ ہے۔ ماہ جولائی کے پرچہ میں مخزن پر ریویو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔ ہمیں اب تک مخزن کے تین نمبر وصول ہوئے ہیں۔ پہلے نمبر میں سادگی اور بناوٹ کے مضمون سے ایڈیٹر کی خوش بیانی کا عمدہ پتہ لگتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے نمبر سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زباندانی کو تقویت دیجاویگی۔ اِسکے ذریعہ شاعری میں دوبارہ رُوح پھونکی جاویگی۔ یہ انگریزی زبان کی دلچسپی اپنی زبان کے مذاق میں پیدا کریگا۔ کچھ مضامین ایسے ہونگے جو کسی مذہب و ملت کے مذاق تک محدود نہ ہوں۔ کچھ انگریزی نظموں کے بامحاورہ ترجمے ہونگے.... کاغذ عمدہ، بیز ولائتی اور چھپائی سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے +